مناقب شیخ الاسلام

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہ العزیز

مولانا افضال الٰہی دیوبندی

مجلس یادگار شیخ الاسلام

مناقب شیخ الاسلام

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہ العزیز

مولانا افضال الٰہی دیوبندی

مجلس یادگار شیخ الاسلام

تاریخ اشاعت ——— ۱۹۹۷ء

نام کتاب ——— مناقب شیخ الاسلامؒ

مرتبہ ——— مولانا افضال الٰہی صاحب

صفحات ——— ۱۶۸

کتابت سرورق ——— حضرۃ سید نفیس رقم مدظلہ

ڈیزائن سرورق ——— کاشانۂ کتابت کراچی

ناشر ——— مجلس یادگار شیخ الاسلامؒ

——— پاکستان چوک کراچی

مطبوعہ ——— المخزن پرنٹرز کراچی

ملنے کے پتے

(۱) مکتبہ رشیدیہ عائشہ منزل اردو بازار۔ کراچی

(۲) مکتبہ شاہد ۱/۹ علی گڑھ کالونی۔ کراچی

(۳) مکی دارالکتب ۔ اردو بازار لاہور

(۴) مکتبہ قاسمیہ الفضل مارکیٹ اردو بازار لاہور

(۵) مکتبہ رشیدیہ سرکی روڈ ۔ کوئٹہ

(۶) کتب خانہ رشیدیہ مدینہ مارکیٹ راجہ بازار راولپنڈی

(۷) مکتبہ بنوریہ۔ بنوری ٹاؤن۔ کراچی

۱۴ و ۱۵ اگست ۱۹۹۷ء

پاکستان اور ہندوستان کی آزادی

کے پچاس سالہ جشن مسرت کے موقع پر

دونوں ملکوں کی ترقی و خوش حالی، اختلافات کے

منصفانہ و آبرومندانہ تصفیے

اور

دونوں ملکوں کے مابین خوش گوار برادرانہ تعلقات کی استواری

کے آرزومند

اراکین

ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

مولانا عبیداللہ سندھی اکیڈمی

اور

مجلس یادگار شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی

پاکستان

فہرست

شریعت وطریقت:

وفات حسرت آیات:

پیش لفظ

فضائل ومناقب شیخ الاسلام

گزشتہ سال ہندوستان کے سفر کا اتفاق ہوا تھا۔ اس سفر کی بہت سی خوش گوار یادوں میں سے ایک یہ ہے کہ دیوبند میں حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے ایک مخلص صادق مولانا محمد افضال الہٰی دیوبندی سے ملاقات کی خوش بختی حاصل ہوئی میرے لیے تو مجرد یہ امر کہ وہ حضرت شیخ الاسلام کے ارادت مند ہیں، خوشی کا موجب ہوا تھا لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ انھوں نے حضرتؒ پر ایک کتاب "شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی۔ صحافیوں کی نظر میں" مرتب کی ہے اور شائع ہوئی ہے تو مزید خوشی ہوئی۔ آں موصوف سے مکتبہ دینیہ میں ملاقات ہوئی تھی۔ انھوں نے حضرتؒ سے میری عقیدت کا اندازہ کیا تو نہایت شفقت سے پیش آئے اور از راہِ نوازش حضرت شیخ الاسلام پر مختلف اہل علم کے مضامین کے ایک مجموعے کی زیارت کرائی جو انھوں نے مرتب کیا تھا۔

مضامین سب مطبوعہ تھے لیکن ان کے انتخاب میں مولانا افضال الہٰی صاحب نے یہ لحاظ رکھا تھا کہ کوئی مضمون حضرت کی یاد میں شائع ہونے والے کسی اخبار یا رسالے کے خصوصی نمبر میں شائع نہ ہوا ہو۔ مولانا کا خیال تھا کہ کسی شخصیت پر خصوصی نمبر تو عام طور پر شائقین کے علم میں آجاتے ہیں، لیکن عام اخبارات و رسائل میں شائع ہونے والے مضامین کا بعض اوقات شائقین کو بھی علم نہیں ہو پاتا۔ مولانا نے ایک اور نکتے کی بات کہی کہ چوں کہ خصوصی نمبر ایک منصوبے کے تحت ایک مقررہ وقت پر شائع کرنا ہوتے ہیں اس لیے ان میں بعض اوقات نہایت اہم مضامین شامل ہونے سے رہ جاتے ہیں اور دوسرے تیسرے درجے کے مضامین بھی جگہ پاکر شہرت حاصل کر جاتے ہیں، جب کہ عام رسالوں اور اخبار کے معمول کے شماروں میں بعض اعلیٰ درجے کے مضامین بھی اہل علم اور اصحاب ذوق کی نظروں

سے پوشیدہ رہ جاتے ہیں۔

مولانا افضال الٰہی صاحب نے یہی بات سوچ کر مختلف اخبارات و رسائل کے عام شماروں میں حضرت شیخ الاسلامؒ پر شائع ہونے والے بے شمار مضامین میں سے اپنے ذوق کے مطابق حضرت علیہ الرحمہ کی شخصیت، سیرت، فضائل و محاسن اور خدمات و کمالات پر مختلف اہل قلم کے معلومات افزا، فکر انگیز، ایمان پرور اور مفید علمی مضامین کا ایک انتخاب تیار کر لیا تھا اور ایک مجلد نوٹ بک میں تمام مضامین کو حوالے کی صراحت کے ساتھ اپنے قلم سے لکھ لیا تھا۔ حضرت شیخ الاسلام سے مولانا کی عقیدت اور اس اہتمام علمی کو دیکھ کر میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ یہ مضامین شائع ہو جائیں تو کتنا اچھا ہو۔ خاکسار کے دریافت کرنے پر مولانا نے بتایا اگر اشاعت کی تو کوئی صورت ان کے پیش نظر نہیں۔ جب میں نے پاکستان میں اس کی اشاعت کا سروسامان کر دینے کا خیال ظاہر کیا تو انھوں نے فوراً اور بغیر کسی ضمانت کے مجموعہ میرے حوالے کر دیا۔

مولانا افضال الٰہی صاحب کے اس اعتماد نے مجھے فکر مند کیا کہ اس کی اشاعت کا انتظام کیا جائے۔ پاکستان واپس آکر میں نے حضرت مخدومی مولانا قاری شریف احمد صاحب مدظلہٗ العالی سے گزارش کی کہ اسے مجلس یادگار شیخ الاسلام کی طرف سے شائع کر دیا جائے تو مناسب ہو! حضرت قاری صاحب کو اس خاکسار پر جو غایت درجے کی شفقت ہے، اس نے گوارا نہ کیا کہ اس آرزو کی عدم تکمیل سے میرے قلب میں ملال پیدا ہو۔ حضرت قاری صاحب خود بھی حضرت شیخ الاسلام مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے خاص نسبت رکھنے والے بزرگ ہیں، اُسی خانقاہِ عظمت سے اخلاص و عقیدت کا رشتہ استوار رکھتے ہیں، اس کتبۂ فکر کی نہایت قابلِ احترام ہستی ہیں اور "مجلس یادگار شیخ الاسلام" اس کا اثر و ثبوت ہے۔ حضرت قاری صاحب مدظلہٗ العالی نے میری اس درخواست کو شرفِ قبولیت بخشا۔ قاری صاحب موصوف کی توجہِ عالی وسامی کا نتیجہ ہے کہ یہ مجموعہ کتابت کے مرحلے سے گزر چکا ہے، پیش لفظ لکھ کر کاتب کے حوالے کر رہا ہوں اور وہ وقت دور نہیں کہ حضرت شیخ الاسلامؒ سے عقیدت رکھنے والے اور دیگر شائقینِ علم اس کے مطالعے سے مستفیض ہو سکیں گے۔

قاری صاحب مدظلہٗ نے خود بھی اس مجموعے پر نظر ڈالی ہے اور اسے مفیدِ اشاعت پایا ہے۔ یہاں اس بات کی صراحت کر دینی چاہیے کہ راقم السطور نے ان مضامین کو بالاستیعاب پڑھا ہے اور

۱- ان میں سے کسی مضمون و بحث کے مکررات کو نکال دیا ہے۔

۲- تاریخ و سنین کی اغلاط کی اصلاح کردی ہے۔

۳- مضامین میں اہلِ قلم کا جدا جدا املا تھا، ان میں ایک اصولِ املا کے مطابق یکسانیت پیدا کردی ہے۔

۴- بعض مضامین میں جہاں طوالت نظر آئی، انھیں مختصر کردیا ہے اور غیر مفید اور لاطائل عبارتوں کو حذف کردیا ہے۔

۵- بعض مضامین جن کی افادیت محدود معلوم ہوئی، انھیں بالکل حذف کردیا۔ اس تحذیف وتقصیر میں ناشر کی حیثیت سے مجلس یادگار شیخ الاسلام کے وسائل کی مجبوری بھی پیش نظر رہی ہے۔

۶- اس انتخاب میں خاکسار کے ایک مضمون نے بھی جگہ پائی تھی۔ یہ مضمون حضرت شیخ الاسلام کے سانحۂ ارتحال کے موقع پر ہفت روزہ چٹان، لاہور میں شائع ہوا تھا۔ اس انتخاب میں اپنا مضمون دیکھ کر طبیعت نہایت مسرور ہوئی تھی۔ لیکن یہ مضمون چوں کہ مجلس کی پہلی کتاب "شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی — ایک سیاسی مطالعہ" میں شامل ہوچکا ہے، اس لیے تکرار مناسب نہ سمجھتے ہوئے اسے بھی حذف کردینا ضروری سمجھا۔

۷- اس سلسلے کی آخری بات یہ ہے کہ فاضل مرتب نے چوں کہ یہ مضامین مختلف رسائل واخبارات سے مختلف اوقات میں نقل کیے تھے، اس لیے ان میں کوئی ترتیب نہ تھی۔ مناسب معلوم ہوا کہ اب ان میں ترتیب قائم کردی جائے۔ لیکن جب اس مقصد سے مضامین پر نظر ڈالی تو اندازہ ہوا کہ یہ کام آسان نہیں۔ مشکل یہ پیش آئی کہ ایک مضمون میں آپ کی زندگی اور شخصیت کا بیان بھی ہے، اس میں آپ کے ذہنی، فکری اور علمی کمالات کا ذکر بھی ہے اور اسی میں آپ کے اخلاقی محاسن، تصوف وطریقت میں آپ کے مقام امتیاز اور آپ کی قومی وملی اور دینی خدمات اور آپ کے درس وتدریس کے خصائص کا تذکرہ بھی آیا ہے۔ بیشتر مضامین ایسے نظر آئے جو حیات وشخصیت، سیرت وخدمات، شریعت وطریقت میں سے ہر عنوان کے تحت جگہ پا سکتے تھے اور ہر جگہ یکساں افادیت کے حامل تھے، لیکن ظاہر ہے کہ انھیں کسی ایک ہی عنوان کے نیچے رکھا جاسکتا تھا اور رکھا ہے۔

۸۔ تمام مضامین کو چار عنوانات کے تحت تقسیم کیا ہے۔ اگر ہر عنوان کو ایک باب تصور کر لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب چار ابواب اور ایک پیش لفظ پر مشتمل ہے۔

آج کل ایک رواج سا بن گیا ہے، اور یہ رواج کوئی بُرا بھی نہیں۔ اپنے اندر افادیت کا پہلو رکھتا ہے اور دلچسپی کا بھی۔ رواج یہ ہے کہ کتاب کے ساتھ مرتب یا مؤلف و مصنف کے مختصر حالات اور اس کے ذوق و خدمات کا مختصر تعارف بھی شامل کر دیا جاتا ہے۔ میں نے اس سلسلے میں فاضل مرتب کو کئی خط لکھے کہ وہ اپنے حالات اور ذوق و مشاغل و خدمات کے ضروری تعارف سے استفادے کا موقع دیں۔ تب کہیں انھوں نے ارادہ کرم اپنے حالات سے مطلع فرمایا — اگرچہ اس باب میں انھوں نے بہت اختصار سے بلکہ اظہار سے اخفا کا کام لیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مولانا نے موصوف علمائے حق کی جس جماعت اور صوفیہ و مشائخ کے جس سلسلۂ عالیہ سے تعلق رکھتے ہیں، اُن کی سیرت کا یہ خاص وصف اور امتیاز رہا ہے کہ وہ بیان پر سکوت کو، اظہار پر اخفا کو، فخر پر عجز کو، اثبات پر نفی کو، اعتراف پر انکسار کو، جلوت پر خلوت کو اور شہرت پر گم نامی کو ترجیح دیتے تھے۔ انھوں نے ملک و قوم اور دین و ملت کی عظیم الشان خدمات انجام دیں، درس و تدریسِ کتاب و سنت اور تالیف و تدوین علوم و معارف کے بے مثال کارناموں سے دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا اور اپنے فکر و عمل سے ہر دور میں تاریخ بنائی لیکن اپنی خدمات کے تعارف اور تاریخ نگاری کا کام انھوں نے دوسروں کے لیے چھوڑ دیا۔

ہم مولانا افضال الٰہی صاحب کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے ہمیں اپنے حالات نہ سہی، اپنی خاص نسبتوں سے آگہی بخشی۔ اس میں بھی حد درجہ انکسار، کمالِ اختصار بلکہ اشارات نما سے کام لیا ہے، لیکن ہم اسے بھی غنیمت سمجھتے ہیں۔ مولانا لکھتے ہیں:

"احقر ایک عامی آدمی ہے۔ قرآن پاک، فارسی اور عربی کی تعلیم دارالعلوم دیوبند میں ہوئی۔ احقر کا وطن خاص دیوبند ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ سے قرابت ہے۔ میرے والد ماجد مولانا سعید احمد صاحب دیوبندی حضرت شیخ الہندؒ کے حقیقی بھانجے ہیں اور فاضل دیوبند ہیں، نیز حضرت شیخ الہندؒ کے تلمیذ اور

مریدہیں۔ میرے دادا قاضی مظہر حسن دیوبندی رؤسائے دیوبند میں سے تھے حضرت شیخ الہند کے حقیقی بہنوئی اور دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے وفات (۱۶ر شعبان ۱۳۷۰ھ ۱۹۵۰ء) تک رکن رہے۔

قاضی مظہر حسن مرحوم کے پانچ لڑکے قاضی محمد یحییٰ، قاضی محمد یونس، مولانا محمد حنیف، مولانا مسعود احمد اور مولانا سعید احمد (ہیں)۔ ان حضرات کے نام شیخ الہندؒ کے کچھ مکاتیب بھی آپ نے شائع فرمائے ہیں[1]

احقر نے حضرت شیخ الہندؒ کو نہیں دیکھا مگر آنکھ کھولتے ہی، والد صاحب مرحوم سے شیخ الہند اور شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کا تذکرہ کانوں میں پڑتا رہا۔ حضرت شیخ الاسلامؒ کو تو بہت قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ان کے علاوہ کوئی شخصیت نظر میں نہیں سمائی۔ علاوہ سفر حج کے کوئی سفر بھی نہیں ہوا۔ یہ ہے میری روداد حیات۔"

فاضل مرتب نے اس مجموعے کا نام "ماقال فی منقبت الشیخ" رکھا تھا۔ ماشاء اللہ خوب نام تھا اور بہت صحیح! لیکن عام اردو داں طبقے کے لیے یہ نام نامانوس محسوس ہوا اور مناسب معلوم ہوا کہ نام کو عام فہم اور سہل التلفظ کر دیا جائے۔ چناں چہ اِسے "فضائل و مناقب شیخ الاسلام" کے عنوان سے شائع کیا جاتا ہے۔

امید ہے کہ حضرت شیخ الاسلامؒ سے ارادت رکھنے والوں کے علاوہ علمی حلقے میں بھی مولانا افضال الٰہی صاحب کی اس خدمت علمی کا اعتراف کیا جائے گا اور اس مجموعے کو پسند کی نظروں سے دیکھا جائے گا۔

ابو سلمان شاہجہان پوری

---

[1] خاکسار نے اپنی تالیف "شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی — ایک سیاسی مطالعہ" میں ایک خط قاضی مظہر حسن کے نام اور ان کے صاحبزادگان میں سے مولوی محمد حنیف اور مولوی سعید احمد مرحوم کے نام ایک ایک خط درج کیا ہے۔ مولانا افضال الٰہی صاحب کا اشارہ اسی طرف ہے۔ اب انہی کی توجہ سے ان کے دادا علیہ الرحمہ قاضی مظہر حسن کے نام ایک مزید خط اور ان حضرات کے مختصر حالات بھی دستیاب ہو گئے ہیں اور مذکورہ تالیف کے دوسرے ایڈیشن میں ان معلومات سے استفادہ کیا ہے (ا۔ س۔ ش)

سعادتِ کبریٰ

مولانا محمد حفظ الرحمان سیوہاروی

اسلام اس دینِ حق کا نام ہے جو انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی اور کائنات کی فلاح و سعادت کے سلسلے میں ہر ایک شعبۂ حیات کا کفیل ہے اس لیے اس کا وجود انسانِ اول کے ساتھ ساتھ عالمِ ہست و بود میں موجود رہا ہے اور فلسفۂ ارتقا کے پیشِ نظر وہی اسلام جو بدءِ وجود میں حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت کے واسطے سے کائنات کی سعادت کا ذریعہ بنا، اس کا عروجِ کامل ذاتِ اقدس خاتم الانبیاء والرسل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سعادتِ کبریٰ کا باعث بنا۔ قرآن عزیز نے آخری پیغام بن کر اسی کی دعوت و تبلیغ کا حق ادا کیا اس لیے اب نہ نبوت و رسالت کا سوال باقی رہا اور نہ وحی کے لیے کوئی ضرورت داعی رہی۔ البتہ رہتی دنیا تک یہ پیغامِ حق ہمیشہ ہدایت و رہنمائی کا حق ادا کرتا رہے گا اور جانشینِ نبوت و رسالت "علمائے حق" اس پیغام و دعوت کے حق کو ادا کرتے رہیں گے۔

عُلَمَاءُ اُمَّتِی کَاَنْبِیَاءِ بَنِی اِسْرَائِیل "درایت و روایت کی تنقیدی خراد پر خواہ صحت کے اس درجے کو نہ حاصل کر سکی ہو جیسے حدیثِ رسول کی صحت کے لیے از بس ضروری ہے، تاہم مضمون اور مفہوم کے اعتبار سے اپنی جگہ بلاشبہ ایک "کلمۂ حق" ہے جس کی تکذیب کی کوئی گنجائش نہیں۔

انبیائے بنی اسرائیل میں حکومت اور مذہبی قیادت اگرچہ الگ الگ چلتی تھیں، اسلام کے اس دور میں جب کہ وہ اپنے عروج کے اس نقطے پر پہنچ چکا تھا جو اتمام و اکمال کا آخری درجہ ہے، فطرت کا تقاضا ہوا کہ دینی قیادت اور سیاسی حکومت نیابت و خلافتِ الٰہی کے انداز میں ایک جگہ جمع ہو جائیں اور نہ صرف یہ بلکہ شعبہ ہائے حیات کے ہر شاخِ دین میں قیادت کی یکتائی اور اکائی صاف روشن نظر آنے لگے۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ پاک کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح ابھری ہوئی نظر آتی ہے کہ شبِ تاریک میں "عابدِ شب زندہ دار"، روزِ روشن میں

ناظم جمعیت علمائے ہند، یکے از بانیانِ ندوۃ المصنفین دہلی، مصنف مصنفات و مؤلفات کثیرہ

ایک بے نظیر "قائد" "معاملات کی پیچیدگیوں کے حل کے لیے ایک عدیم المثال "مفکر" قضایا اور وفود کے اہم معاملات میں ایک ناقابلِ مثال "جج" اور میدان ازم میں ایک محیر العقول "مجاہد" اور دینی علوم و افکار میں ایک جامع کمالات "ہادی"، کو اگر ایک شخصیت میں سمویا ہوا دیکھ سکتے ہو تو وہ صرف ایک ہی ذات اور ایک ہی ہستی ہے جس کا نام پاک "محمد" ہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

اس لیے قدرتی تقاضا تھا کہ آپ کے جانشین اور نائب یعنی "علمائے حق یا علمائے ربانیین" میں بھی اپنے اپنے درجات کے مطابق وہ جامعیت موجود ہونی چاہیے جو اسلامی قیادت و سیاست کے لیے ناگزیر ہے۔ پس یہ تاریخی حقیقت ہے کہ خلافتِ راشدہ سے آج کے دور تک ہر دور اور ہر زمانے میں علمائے ربانیین کی چند ہستیاں ہمیشہ عالم وجود میں رہی ہیں جن کی قیادت و سیادت زندگی کے ہر پہلو پر چھائی ہوئی نظر آتی ہے اور باقی علما اسی محور پر مختلف سیاروں کی طرح گردش کرتے نظر آتے ہیں۔

بلاشبہ حسن عقیدت سے جدا ہو کر بھی یہ ماننا پڑتا ہے کہ اس آخری دور میں جب کہ علمائے حق اور علمائے ربانیین کا آہستہ آہستہ عام طور پر فقدان ہوتا نظر آتا ہے "مولانا حسین احمد مدنی" کی شخصیت سلف صالحین کا اسوۂ کامل نظر آتی ہے علمی تبحر، تقویٰ و طہارت، وقت کی نبض شناسی کے ساتھ ساتھ اجتماعی اور سیاسی معاملات میں دقت بینی اور حقیقت شناسی غرض علم و عمل کی یکسانیت کا کا ایک پیکر اس چلتی پھرتی دنیا میں اس طرح نظر آتا تھا کہ گویا دنیا اور دین کی خیر و فلاح کا ایک ممتاز نشان ہے۔

دارالعلوم دیوبند کی مسند درس پر حدیثی و تفسیری علوم و معارف کا جو ذخیرہ علما اور طلبہ کے سامنے درس بخاری کے نام سے پیش ہوتا تھا اس کی لطف اندوزیوں کو کچھ وہی جان سکتے ہیں جن کی زندگیاں قرآن و حدیث کے مطالعے سے سرشار رہی ہوں۔

درس و تدریس کے اس شغل و انہماک کے ساتھ ساتھ عصر اور مغرب کے درمیان کی وہ مجلس ناقابل فراموش ہیں جن میں تشنگانِ معارف و تصوف اہلِ معارف و اصحابِ روحانیت کے لطائف و نکات باطنیہ سے سیراب ہوتے رہتے تھے اور پھر شب بلا اور تاریک اندھیاری میں جب کہ خدا کی مخلوق راحت و آرام میں مشغول رہتی تھی "نفی و اثبات" کی وہ صدائیں دلوں کو گرمانے کے لیے کچھ کم نہ تھیں جن کی ایک ایک حرکت سے قلوب میں بیداری اور خدارسی کا رجحان پیدا ہوتا تھا۔

پھر یہ کامل شخصیت ہی کے بس کی بات تھی کہ درس وتدریس اور بیعت وارشاد کے روحانی فیوض وبرکات کے ساتھ ساتھ غلامی کے دور میں آزادی ملک ووطن کے لیے سرفروشانہ جدوجہد بھی جاری ہے اور قید فرنگ بھی، عملی کاوشیں بھی ہیں اور فکری رہنمائی بھی اور ہر قسم کی سرگرمیوں کے باوجود توکل علی اللہ اور حق وصداقت پر ثابت قدمی کا ایک کوہِ وقار نظر آتا ہے۔

ملک کی آزادی کے بعد ملک میں امن وامان اور وطن عزیز میں مسلمانوں کے باعزت مقام کے لیے رہنمائی بھی موجود ہے اور عملی سرگرمیاں بھی۔ جیل میں ساتھ رہنے والوں کے لیے یہ بات بھی کچھ کم عجوبہ نہ تھی کہ دن میں ایک طرف قیدیوں کی خدمت اپنے خادموں اور نیازمندوں کے ساتھ مربیانہ محبت وشفقت کے مشاغل ہیں تو دوسری طرف قرآن وحدیث کے عوارف ومعارف کا سلسلہ بھی جاری ہے رات کے بڑے حصہ میں مراقبہ ومحاسبہ کی وہ نمایاں زندگی نظر آتی ہے جس سے نیازمند تو کجا "جیلر" "سپرنٹنڈنٹ جیل" "ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ" اپنے راؤنڈ میں ان نظاروں کو دیکھ کر انتہائی متاثر نظر آتے ہیں۔ اور یہ محسوس کرتے ہیں کہ سیاسی اور پولیٹیکل زندگی کا یہ انسان عام اصطلاح میں لیڈر نہیں ہے بلکہ خدا کی ایسی برگزیدہ ہستی ہے جو مادیت و روحانیت کے امتزاج کے ساتھ ایک طرف اخلاص وطن کے جذبہ میں سرشار ہے تو دوسری جانب معرفتِ الٰہی کے بحرِ ناپیدا کنار میں غوطہ زن ہے۔

اسی وجہ سے مسلم وغیر مسلم ہر شخص پر اس کے تقویٰ، طہارت، دیانت، امانت اور صداقت کی چھاپ پڑتی ہے ایسی جامع شخصیتیں اب کہاں ہیں؟ آنکھیں ڈھونڈھتی ہیں، دل تڑپتا ہے لیکن اس ناپائیدار ہستی میں ایسے مقدس وجود کمیاب ونایاب نظر آتے ہیں۔

کہنے کو بہت کچھ جی چاہتا ہے آنکھوں نے بہت کچھ دیکھا ہے دل نے بہت کچھ سمجھا ہے لیکن وقت کے ناگوار حوادث نے کچھ ایسا دن اور رات کے وقت کو جکڑ بند کر لیا ہے کہ قلم اٹھانے کا یارا ہی باقی نہ رہا۔

اے کاش! پچھلے دنوں کی طرح ہنگامہ آرائیوں کے باوجود یہ توفیق نصیب ہو کہ دل کی امنگیں اس راہ میں جس طرح بے چین نظر آتی ہیں ان امنگوں کے بروئے کار نظر آنے کی صورت نصیب ہو سکے۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

(ماہنامہ تذکرہ۔ دیوبند، مئی وجون سنہ ۱۹۰۹ء)

حضرت مدنیؒ سے آخری ملاقات

مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی

۷ نومبر ۱۹۵۷ء کو حضرت اقدس رائے پوری مدظلہٗ کی زیارت کے بعد رائے پور سے واپس ہوتے ہوئے حضرت مدنی رحمۃ اللہ تعالیٰ کی عیادت کے لیے دیوبند پہنچا۔ اس زمانے میں حضرت مخصوص اوقات میں مردانہ میں تشریف لا رہے تھے۔ نمازِ عصر کے بعد جو حضرت کی تشریف آوری کا وقت تھا درِ دولت پر حاضری دی چمن میں طلبہ و علما و زائرین کا مجمع کثیر حضرت کے لیے چشم براہ تھا۔ حضرت کی چارپائی خالی تھی اور سامنے کی چارپائی بھی باہر سے آنے والوں کے خالی چھوڑ دی گئی تھی میں طلبہ کے مجمع میں سے گزرتا ہوا چارپائی پر بیٹھ گیا اور انتظار کرنے والوں میں شامل ہو گیا یکایک سارے مجمع کی نگاہیں زنان خانہ کے دروازہ کی طرف اٹھ گئیں۔ حضرت آہستہ آہستہ قدم رکھتے ہوئے، مسکراتے ہوئے تشریف لائے اور اپنی چارپائی پر رونق افروز ہو گئے۔ معمول کے مطابق حاضرین اپنی جگہ بیٹھے رہے کیوں کہ کھڑے ہونے کی کسی کو اجازت نہ تھی سارے مجمع پر اب سکوت کا عالم طاری تھا اس سکوت کو حضرت والا نے میری طرف مخاطب ہو کر ان کلمات سے توڑا۔ "میرٹھ ہی سے آرہے ہیں آپ؟"

میں نے عرض کیا "جی نہیں" "اس وقت تو رائے پور سے آرہا ہوں"

حضرت مدنی:۔ کس وقت تشریف لائے؟

میں:۔ قبل ظہر آیا تھا۔

حضرت مدنی:۔ (کچھ شکایت کے لہجہ میں) تو پھر کھانا کہاں کھایا؟

میں:۔ حضرت میرا بچہ زین الساجدین امسال دارالعلوم میں ہی پڑھ رہا ہے اس کے حجرہ میں چلا گیا تھا وہیں کھانا کھا لیا

حضرت مدنی:۔ تو آپ اپنے ہی مہمان ہوئے۔

میں:۔ جی نہیں مدرسہ کا بھی۔ حضرت مہتمم صاحب سے ملاقات کرنے کوٹھی پر گیا تھا، وہ تو باہر

تشریف لے گئے، مگر حضرت نائب مہتمم صاحب نے چائے پلا دی۔
حضرت مدنی:۔ (مسکراتے ہوئے) صرف چائے یا کچھ اور بھی!
میں:۔ جی ہاں چائے کے ساتھ کچھ مٹھائی بھی تھی۔
یہ سن کر حضرتؒ نے تبسم فرمایا اور فرمایا "تو ٹھیک ہے"
قدرے توقف کے بعد پوچھا آپ کے صاحبزادے کیا پڑھ رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا ہدایہ مقامات وغیرہ کتابیں ہو رہی ہیں۔
حضرت مدنی:۔ آپ کے کتنے صاحبزادے ہیں!
میں:۔ حضرت دو ہیں دوسرا چھوٹا گورنمنٹ انٹر کالج میرٹھ میں آٹھویں کلاس میں پڑھ رہا ہے۔
حضرت مدنی:۔ (مسکراتے ہوئے) تو آپ ایک کو جنت میں بھیج رہے ہیں اور دوسرے کو دوزخ میں۔
میں:۔ جی نہیں حضرت وہ دوزخ میں سے جنت کے لیے انشاء اللہ تعالیٰ کوئی راستہ نکال لے گا۔
حضرت مسکرانے لگے پھر کچھ توقف کے بعد پوچھا حضرت رائے پوری کیسے ہیں؟
میں:۔ الحمدللہ اب تو اچھے ہیں مگر کمزوری خاصی ہے۔
حضرت مدنی:۔ ان کا لاہور جانے کا ارادہ ہے یا نہیں؟
میں:۔ حضرت انھوں نے تو انکار فرمایا تھا مگر معلوم ہوا ہے کہ لے جانے والے کار لینے گئے ہیں جب کار دروازہ پر لا ہی کھڑی کریں گے، تو حضرت کو مجبوراً جانا ہی پڑے گا۔ حضرت آپ جیسے بزرگوں کو لوگ بہت پریشان کرتے ہیں۔
حضرت کے چہرہ پر اب سنجیدگی طاری ہو گئی اور پر درد لہجے میں فرمایا، میں بزرگ کب ہوں، میں تو سگِ دنیا ہوں، مدرسہ سے پانچ سو روپے تنخواہ لیتا ہوں۔
میں نے عرض کیا حضرت یہ تنخواہ تو آپ کی ایک دن کی محنت کا بھی معاوضہ نہیں ہے۔
حضرت مدنی:۔ جی نہیں یہ میں ہی ہوں جو اتنی بڑی تنخواہ لیتا ہوں دوسرے علما کہاں اتنی تنخواہ لیتے ہیں۔
میں:۔ مگر حضرت ان پانچ سو میں جناب والا کے پلے کیا پڑتا ہے ہم لوگ کھا پی کر برابر کر جاتے ہیں۔
حضرت خاموش ہو گئے اب طلبہ کی عرضیاں اور آنے والوں کی درخواستیں پیش ہونے لگیں حضرت

ان طویل تحریروں کو بڑے تحمل سے پڑھتے اور ہر ایک کے متعلق حکم صادر فرمادیتے ہیں نے حضرت کے قریبی عزیز مولانا فرید الوحیدی سے کہا ان درخواستوں کے پڑھنے سے حضرت کو بڑا تعب ہوتا ہے بہتر ہو کہ ان کا خلاصہ کرادیا جایا کرے مولانا فرید احمد نے فرمایا کوشش تو کی جاتی ہے کہ حضرت کو پریشانی نہ ہو، لیکن کوئی نظم قائم نہیں رہتا۔ اب مغرب کا وقت آگیا تھا حضرت نے میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا۔ آپ مسجد تشریف لے جائیں میں تو یہیں نماز پڑھوں گا۔ ڈاکٹر مجھے مسجد میں نہیں جانے دیتے۔ میں نے عرض کیا حضرت کمزوری زیادہ ہے، ڈاکٹروں کا مشورہ مناسب ہے۔ حضرت کے چہرہ پر پھر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور فرمایا آپ بھی الٹی بات کہتے ہیں۔ ومن اظلم ممن منع مساجد اللّٰہ ان یذکر فیھا اسمہ۔

میں نے عرض کیا حضرت لا یکلف اللّٰہ نفسا الا وسعھا بھی تو اپنی جگہ ہے حضرت مسکراتے ہوئے کھڑے ہو گئے اور آہستہ آہستہ جناب قاری صاحب کے حجرہ میں چلے گئے۔

یہ حضرت سے آخری ملاقات تھی جس میں شرف گفتگو حاصل رہا۔ اس کے بعد ۲۴ نومبر ۱۹۵۷ء کو دارالعلوم میں حضرت مہتمم صاحب کی دعوت پر ایک کمیٹی میں شرکت کے لیے جانا ہوا تو حضرت کی علالت میں اضافہ ہو چکا تھا۔ ملاقاتیں بند تھیں، تاہم خصوصی طور پر ہم لوگوں کو صرف زیارت کی اجازت دی گئی۔ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے ساتھ میں بھی باریاب ہوا۔ حضرت تکیوں کے سہارے بیٹھے ہوئے تھے آہستہ سے سلام کا جواب دیا اور بیٹھنے کی ہدایت فرمائی مگر ہم لوگ معذرت کر کے واپس چلے آئے۔ گمان غالب تھا کہ یہ حضرت سے آخری ملاقات ہے۔ چناں چہ یہ گمان صحیح ثابت ہوا اور اس کے بعد حضرت کے جنازے ہی پر حاضری ہوئی۔ رحمہ اللّٰہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ کاملۃ۔ (ماہنامہ الحرم۔ میرٹھ، دسمبر ۱۹۵۷ء)

. . . : . .

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رح سے میری واقفیت اور تاثرات

مولانا محمد منظور صاحب نعمانی

غالباً ۱۳۳۷ھ کی بات ہے میں اپنے وطن سنبھل کے عربی مدرسہ (مدرسۃ الشرع) میں صرف و نحو کی ابتدائی کتابیں پڑھتا تھا میری عمر اس وقت ۱۴ سال ہوگی، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا نام میں اپنے اساتذہ سے سنا کرتا تھا اس لیے قلب میں ان کی خاص عظمت تھی۔ اسی زمانے میں یہ خبریں آئیں کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ علیہ مالٹا سے رہا ہو کر عنقریب تشریف لانے والے ہیں اگرچہ چالیس سال پہلے کی بات ہے مگر مجھے کل کی بات کی طرح یاد ہے کہ مدرسہ کے سن رسیدہ مہتمم جناب منشی حمید الدین صاحب مرحوم (جن کو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی سے بیعت و ارادت کا شرف حاصل تھا) ایک دن مدرسہ تشریف لائے اور حضرات اساتذہ کو اپنی ایک تازہ نظم سنائی جس میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی رہائی کی خوش خبری پر اپنے جذبات مسرت کا اظہار کیا تھا۔ میں نے سب سے پہلے اس نظم میں شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے رفیقوں اور خاص خادموں کی حیثیت سے حضرت مولانا حسین احمد صاحب اور مولانا عزیر گل صاحب کا نام سنا۔

پھر کچھ عرصے کے بعد سننے میں آیا کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ مالٹا سے رہا ہو کر دیوبند تشریف لے آئے غالباً یہ تشریف آوری رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ میں ہوئی تھی۔ شروع شوال میں جب عربی مدارس کا تعلیمی سال شروع ہوتا ہے میرے والد ماجد نے آیندہ تعلیم کے لیے مجھے دہلی استاذی حضرت مولانا کریم بخش صاحب سنبھلی مرحوم کے ساتھ بھیجنے کا فیصلہ فرمایا (مولانا مرحوم ان دونوں مدرسہ عبد الرب دہلی میں مدرس تھے)، مولانا نے نظام سفر اس طرح بنایا کہ پہلے اپنے استاد حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کے لیے دیوبند جائیں گے اور پھر

ایڈیٹر ماہنامہ الفرقان۔ لکھنؤ

وہاں سے دہلی۔ مجھے بھی اس کی خوشی تھی کہ حضرت شیخ الہندؒ کی زیارت نصیب ہوگی اس زمانے میں میرے وطن سنبھل اور مراد آباد کے درمیان ٹرین نہیں چلتی اس لیے سنبھل سے مراد آباد تک سفر لاری سے ہوا مراد آباد پہنچ کر دیو بند کے لیے ٹکٹ خرید لیے گئے لیکن تھوڑی دیر کے بعد مراد آباد کے ایک بزرگ سے حضرت استاذ کو یہ معلوم ہوگیا کہ حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ آج ہی دیو بند سے فتح پور ہسوہ روانہ ہونے والے ہیں اس لیے اس وقت دیو بند پہنچ کر حضرت کی زیارت نہ ہو سکے گی۔ افسوس کے ساتھ خریدے ہوئے ٹکٹ واپس کر دیے گئے اور دہلی کے ٹکٹ لے کر براہ راست دہلی روانہ ہوگئے صبح کو جب ہم دہلی پہنچ کر مدرسہ عبد الرب میں داخل ہوئے تو وہاں فرش و فروش کا کچھ غیر معمولی اہتمام دیکھا دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ اسی وقت تشریف لا رہے ہیں شام تک یہیں مدرسہ میں قیام رہے گا اور آج ہی یہاں سے فتح پور کے لیے روانگی ہو جائے گی اُستاذ مرحوم اور اس ناچیز کو بھی یہ سُن کر بڑی خوشی ہوئی، تھوڑی ہی دیر کے بعد حضرت اپنے رفقاء سمیت تشریف لے آئے۔ ناچیز کو بھی زیارت کی سعادت نصیب ہوئی۔ مولانا عزیر گل صاحب خادم خاص کی حیثیت سے ساتھ تھے ان کی زیارت بھی سب سے پہلے اسی وقت ہوئی۔ حضرت مولانا حسین احمد صاحب کا نام نامی سُن چکا تھا اس لیے قدرتی طور پر ان کی زیارت کا بھی اشتیاق تھا۔ دریافت کرنے پر کسی سے معلوم ہوا کہ مولانا اس سفر میں حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ نہیں ہیں۔

چند مہینے کے بعد (صفر ۱۳۳۹ھ میں) حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ کا وصال ہوگیا، مالٹا سے حضرت کی آمد پر خلافت کی تحریک میں ایک دم وسعت اور طاقت پیدا ہوگئی ملک بھر میں خلافت کے نام پر جلسے اور کانفرنسیں ہونے لگیں ہمارے وطن سنبھل میں بھی ایک بڑا جلسہ ہوا جس میں قریب قریب وہ سب بڑے عُلما تشریف لائے جو خلافت کی تحریک میں اس وقت نمایاں اور پیش پیش تھے حضرت مولانا حسین احمد مدنی بھی تشریف لائے۔ مجھے یاد ہے کہ مدنی نسبت اور اسارت مالٹا کی وجہ سے ہر شخص کو دوسرے بزرگوں سے زیادہ حضرت مولانا ہی کی زیارت کا شوق تھا۔ کم عمری کے باوجود میرا بھی یہی حال تھا حضرت مولانا کی پہلی زیارت اسی موقع پر ہوئی۔ خوب یاد ہے کہ حضرت مولانا جدھر

کو نکلتے تھے مشتاقانِ زیارت کی بھیڑ لگ جاتی تھی۔

مولانا نے اس جلسہ کی اپنی تقریر میں لوگوں کے اصرار پر ان تکلیفوں، مصیبتوں اور بربادیوں کی تفصیل بھی بیان فرمائی تھی۔ جن سے پہلی جنگ عظیم کے دوران میں اہلِ مدینہ کو گزرنا پڑا، یہ واقعات ہر مسلمان کے لیے بہت دردناک تھے مجھے اب تک اس تقریر کے خاصے اجزا یاد ہیں۔

اس کے کچھ عرصے کے بعد حضرت مولانا گرفتار کر لیے گئے اور وہ تاریخی مقدمہ چلا جو کراچی کے مقدمے کے نام سے مشہور ہے۔ اس قید سے رہائی کے بعد اپنی طالب علمی کے دور میں دوسری دفعہ مولانا کی زیارت مراد کے جمعیۃ العلما کے اجلاس میں ہوئی، یہ وہ زمانہ تھا جب نجدی طاقت نے مکہ معظمہ پر قبضہ کر لیا تھا اور شریف حسین کو وہاں سے چلا جانا پڑا تھا خبریں آرہی تھیں کہ شریف حسین بعض یورپین طاقتوں سے مدد حاصل کر کے نجدیوں سے جنگ کرنے کی تیاری کر رہے ہیں اور اندیشہ تھا کہ اگر ایسا ہوا تو یہ جنگ سرزمین حرم پر ہوگی۔ جمعیۃ العلما کے اجلاس میں ایک ریزولیوشن پیش کیا گیا تھا جس میں شریف حسین کے اس ارادے پر ناراضی کا اظہار کیا گیا تھا اور مکہ معظمہ کی حرمت کے نام پر اس ارادہ و اقدام سے باز رہنے کی اپیل کی گئی تھی۔ اس ریزولیوشن کی تحریک یا تائید کرتے ہوئے حضرت مولانا مدنی نے ایک بڑی بسیط تقریر فرمائی تھی اور مکہ معظمہ کی حرمت اور وہاں ہر قسم کے جنگ و جدال کی دائمی ممانعت سے متعلق حدیثوں کے متن اس قدر کثرت سے پڑھ کر سنائے تھے کہ دینیات کے ایک طالب علم کی حیثیت سے اس وقت میرا یہ احساس تھا کہ شاید ان کو حدیث کے دفتر کے دفتر یاد ہیں اور اس وصف میں کوئی دوسرا عالم غالباً ان کا ہم پلہ نہ ہوگا۔

میرے لیے مولانا مرحوم کی زیارت اور تقریر سننے کا یہ دوسرا موقع تھا، اگلے سال میں پڑھنے کے لیے دارالعلوم دیوبند چلا گیا وہاں دو سال قیام رہا، حضرت مولانا مدنی کا مستقل قیام اس زمانے میں غالباً سلہٹ رہتا تھا لیکن دیوبند بار بار تشریف لانا ہوتا تھا چنانچہ میرے دو سالہ قیام کے زمانے میں کئی بار تشریف آوری ہوئی اور قریباً ہر دفعہ طلبہ اور مدرسین کے اصرار سے آپ نے تقریر بھی فرمائی اس زمانے کی آپ کی تقریریں معلومات سے معمور ہوتی تھیں۔ خاص طور سے ہم طلبہ ان سے بہت فائدہ اٹھا سکتے تھے مجھے یاد ہے کہ میں نے بعض خاص تقریریں قلمبند بھی کی تھیں۔

جس سال میں دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث سے فارغ ہوا اسی سال کے ختم پر کچھ ایسے واقعات دارالعلوم میں پیش آئے کہ حضرت الاستاذ مولانا سید انور شاہ صاحب نے دارالعلوم چھوڑنے کا فیصلہ فرمالیا۔ اس وقت دارالعلوم کی صدارت تدریس کے لیے کوئی شخصیت حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی سے زیادہ موزوں نہیں ہو سکتی تھی یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہوا کہ مولانا نے اس ذمہ داری کو قبول فرمالیا، چوں کہ دارالعلوم میں میری طالب علمی کا دور حضرت مولانا کی تشریف آوری سے پہلے ختم ہو چکا تھا اس لیے مجھے باضابطہ تلمذ کا شرف تو حاصل نہیں ہوا لیکن گوشتہ ۳۰۔۳۲ سال کی مدت میں دیوبند میں بھی اور باہر سفروں میں بھی خدمت میں حاضری اور رفاقت کی سعادت سیکڑوں بار حاصل ہوئی۔ حضرت مولانا کی زندگی کے جن پہلوؤں سے اپنی ذاتی واقفیت اور تجربہ کی بناپر میں زیادہ متاثر ہوا اس وقت بغیر کسی خاص ترتیب کے بس انھیں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

نماز کا اِمتیاز:

خالص دینی اعمال میں نماز سب سے زیادہ عام چیز ہے اس لیے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ جیسی کسی عظیم دینی شخصیت کی نماز کا ذکر شاید بہت سے لوگوں کو کچھ عجیب سا معلوم ہوگا لیکن واقعہ یہ ہے کہ نماز کی حقیقت اگر کسی بندے کو نصیب ہو تو اس کو بندگی کا کمال نصیب ہوا اسی لیے نماز کو معراج المومنین کہا گیا ہے اور اسی لیے سیدنا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ نے اپنے عہد خلافت میں اسلامی قلمرو کے تمام عمال یعنی صوبوں کے افسرانِ اعلیٰ کے نام بھیجے جانے والے ایک مراسلہ میں سب سے پہلی بات یہ لکھی تھی کہ..

ترجمہ۔ تمہارے کاموں میں سب سے زیادہ اہم اور دوسرے سب کاموں سے زیادہ اہتمام کی مستحق میرے نزدیک نماز ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ نماز صرف ایک دینی عمل ہی نہیں ہے بلکہ دینی نظام میں اس کا مقام وہ ہے جو انسان کے جسمانی نظام میں اس کے قلب اور روح کا مقام ہے قلب کے بارے میں مشہور حدیث ہے کہ اسی کے صلاح وفساد پر پورے وجودِ انسانی کے صلاح وفساد کا مدار ہے اسی طرح نماز کے بارے میں بعض حدیثوں میں وارد ہوا ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے نماز کو جانچا جائے گا۔ اگر بندہ کی نماز اچھی نکلی تو وہ کامیاب و بامراد ہوگا اور وہ ناقص وخراب نکلی تو وہ نامراد اور خسارہ میں

رہے گا اور بعض روایات میں طرح ہے کہ جس بندہ کی نماز ٹھیک نکلے گی اس کے سارے عمل ٹھیک مانے جائیں گے اور جس کی نماز خراب ہو گی اس کے سارے عمل خراب قرار دیے جائیں گے۔

اسی قسم کی روایات کی بنا پر میں نے یہ کہا ہے کہ نماز کا مقام دینی نظام میں قلب و روح کا مقام ہے۔

نماز کی عظمت و اہمیت کا اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید میں سیدنا حضرت ابراہیم خلیل اللہ سے یہ دُعاء نقل کی گئی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (ترجمہ) اے میرے رَب مجھے ایسا کر دے کہ میں اچھی نماز ادا کرنے والا ہو جاؤں اور میری نسل میں سے بھی" بہر حال اللہ کے کسی بندے کو نماز کی حقیقت اور اس کی روح کا نصیب ہونا اس کا سب سے بڑا کمال اور اعلیٰ درجے کی کامیابی ہے۔ نماز کی روح کیا ہے؟ ـــــــ اس کے جاننے کے لیے امام عارف حضرت شاہ ولی اللہ کی یہ عبارت پڑھ لیجیے۔۔۔

یعنی اللہ کے سامنے حضوری اور سکینت و محبت آمیز تعظیم کے ساتھ اس کے جلال و جبروت کا تصور اور گہرا دھیان بس یہی نماز کی روح ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ ج۲)

حضرت شاہ صاحب نے نماز کی جو رُوح بتائی ہے وہ بلاشبہ ایک باطنی حال ہے جس کو آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا لیکن جس طرح رنج و غم فکر و الم، مسرت و شادمانی لذت و سرور وغیرہ قلبی و باطنی کیفیات کے آثار کسی کے چہرہ پر دیکھ کر یا اس کی گفتگو اور آواز میں ان کے اثرات محسوس کر کے ان اندرونی کیفیات کا اندازہ ہر ہوش و گوش والا کر لیتا ہے اسی طرح نماز کی اس روح کے آثار بھی دوسروں کے لیے بعض اوقات اتنے عیاں ہو جاتے ہیں کہ وہ گویا آنکھوں سے دیکھ لیتے اور کانوں سے سُن لیتے ہیں۔ بعض صحابۂ کرام نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو بیان کیا ہے کہ نماز کی حالت میں ہم آپ کے سینۂ مبارک سے چکی چلنے کی سی (یا بعض راویوں کے بیان کے مطابق ہانڈی میں جوش آنے کی سی) ایک آواز سُنتے تھے تو یہ دراصل اسی اندرونی کیفیت کا ایک اثر تھا جس کو دوسرے بھی محسوس کرتے تھے۔

اس تمہید کے بعد یہ عاجز عرض کرتا ہے کہ حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ اور قریب کھڑے ہو کر جب کبھی نماز ادا کرنے کا اتفاق ہوا تو ہمیشہ یہ محسوس

ہوا کہ حضرت مولانا وہ نماز پڑھتے ہیں جو ہم کو نصیب نہیں خاص کر جب مولانا فجر کی نماز میں قنوت نازلہ پڑھتے تھے تو بعض اوقات تو خطرہ ہونے لگتا کہ کہیں قلب نہ پھٹ جائے۔

ادھر کئی سال سے حضرت کے گھٹنوں میں مستقل تکلیف رہتی تھی جس کی وجہ سے اٹھنا بیٹھنا خاص کر مسجد میں جانا اور سجدے سے کھڑا ہونا بڑی تکلیف اور مشقت کے ساتھ ہو سکتا تھا یہاں تک کہ دیکھنے والوں کا بھی دِل دُکھتا تھا لیکن اس تمام عرصے میں فرائض ہی نہیں بلکہ اوابین اور تہجد وغیرہ نوافل بھی ہمیشہ کے معمول کے مطابق طول قراءت اور طول قیام ہی کے ساتھ ادا فرماتے تھے معلوم ہوتا تھا کہ جس حالت کو ہم سخت تکلیف ومشقت سمجھ رہے ہیں ان کے لیے اسی میں راحت ولذت ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ حال اسی بندے کا ہو سکتا ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "قرۃ عینی فی الصلوٰۃ" اور یابلال ارحنی بالصلوٰۃ" والی کیفیت سے خاص حصّہ ملا ہو۔

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبّت اور اتباعِ سنّت:

حدیث میں حقیقت ایمان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے وابستہ بتلایا گیا ہے کہ جس شخص کو اپنے ماں باپ، اپنی اولاد اور خود اپنی ذات سے بھی زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت نہ ہو اس کو حقیقت ایمان نصیب نہیں ہے اور حضورؐ کی اس محبت کا لازمی نتیجہ آپ سے نسبت رکھنے والی ہر چیز کی عظمت ومحبت اور آپ کی سنتوں اور عادات واطوار کے اتباع کا اہتمام اور شغف ہے۔

اس عاجز نے اس باب میں بھی حضرت مولانا کو بہت ممتاز پایا تا رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ادنیٰ نسبت رکھنے والی ہر چیز کے ساتھ حتیٰ کہ مدینہ طیبہ کی مٹی کے ساتھ حضرت مولانا کو جو خاص قلبی تعلق تھا جس کا ظہور اپنے موقعے پر عملی زندگی میں قدرتی طور پر ہوتا رہتا تھا اس کی مثال اس عاجز نے دوسری جگہ نہیں دیکھی۔

اسی طرح اتباعِ سنّت کا اہتمام اور شغف عبادات ہی میں نہیں بلکہ امور معاشرت اور عادات میں بھی جس قدر فرماتے تھے تلاش کرنے والے کو اس کی مثالیں خواص اہل دین میں بھی شاذ و نادر ہی ملیں گی۔ اس سلسلے میں بعض عادات اور روزمرّہ کی بعض

ایسی باتوں کا ذکر کرنا غالباً نامناسب نہ ہوگا جن سے اندازہ ہوسکے کہ سنن نبویہ کا اتباع گویا آپ کا مزاج بن گیا تھا۔ مثلاً تکیہ چمڑے کا استعمال فرماتے تھے، کھانا کھاتے وقت نشست ہمیشہ سُنّت کے مطابق ہوتی تھی۔ اپنے دسترخوان پر (جو عام طور پر گول ہوتا اور جس پر دس بارہ آدمی آپ کے ساتھ دائرہ بنا کر بیٹھتے) سالن ایک ہی بڑے برتن میں ہوتا اور سب کے ہاتھ اسی ایک برتن میں پڑتے حتیٰ کہ اگر کہیں دعوت میں شرکت فرماتے اور وہاں آج کل کے رواج کے مطابق ہر شخص کے کھانے کی پلیٹ الگ ہوتی تو اپنے قریب والوں کو اپنے ساتھ شامل فرما کر وہاں بھی مسنون طریقے پر ان کے ساتھ ایک ہی پلیٹ میں کھانا تناول فرماتے، اسی طرح اُٹھنے بیٹھنے اور لیٹنے سونے میں حتیٰ کہ لباس اور جوتا پہننے میں بھی طریق سُنّت کی پابندی فرماتے، اگر آپ کے تشریف لانے پر آپ کے نیازمند اور خدام تعظیماً کھڑے ہوجاتے (جیسا کہ آج کل کا عام دستور ہے) تو ناراضگی کا اظہار فرماتے، بلکہ بعض اوقات اس اظہارِ ناراضگی میں برافروختگی بھی ہوتی اور فرماتے کہ آپ لوگ کیوں کھڑے ہوئے کیا آپ کو معلوم نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح کھڑے ہونے سے ناگواری ہوتی تھی۔

یہ روزمرہ کی چند مثالیں ہیں جن سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ معاشرت اور عادات میں بھی سنن نبویہ کا اتباع آپکا مزاج بن گیا تھا۔

تواضع اور خاکساری:

اللہ تعالیٰ کے نزدیک حضرت مولانا کا جو مقام ہوگا اس کا علم تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے، لیکن جو لوگ ان کے احوال سے کچھ بھی واقف ہیں وہ اتنا ضرور جانتے ہیں کہ اس زمانہ میں کسی عالمِ دین اور کسی روحانی پیشوا کو جو بڑی سے بڑی عظمت، وجاہت، بلندو برتری حاصل ہوسکتی ہے اللہ تعالیٰ کے فضل سے وہ مولانا کو حاصل تھی، دارالعلوم دیوبند جیسی باعظمت دینی درسگاہ کے وہ صدر اور شیخ تھے، ہزاروں عالم (جو اپنی اپنی جگہ اپنے حالات کے مطابق کسی نہ کسی دینی خدمت میں لگے ہوئے ہیں اور ان میں سے بہتوں کے خاصے وسیع وعریض حلقے ہیں) ان کے شاگرد اور فدائی، ہندوستان کے طول وعرض میں لاکھوں مُریدین، پھر ہندوستان کی جنگ آزادی میں ان کی عظیم قربانیا

کے طفیل ملک کے اہل حکومت و سیاست کی نگاہ میں بھی ان کا خاص مقام اور حکومت کے اونچے سے اونچے عہدہ داروں کی نگاہ میں ان کا غیر معمولی احترام۔

حسن تواضع کی چند مثالیں:

ان ساری عظمتوں اور بلندیوں کے باوجود ان میں تواضع اور انکسار اس قدر تھا کہ جن لوگوں کو قریب رہنے اور برتنے کا موقع نہ ملا ہو وہ کبھی اندازہ نہیں لگا سکتے، بلکہ یہ عاجز اس موقع پر صفائی کے ساتھ یہ ظاہر کر دینا ہی مناسب سمجھتا ہے کہ بعض اوقات راقم سطور کو خیال ہوتا تھا کہ حضرت کا تواضع شاید دوسروں کے لیے مضر ہو۔ اس سلسلے میں بھی خود اپنے ساتھ گزرے ہوئے بعض واقعات ذکر کرنے کو جی چاہتا ہے۔

سنہ ۱۳۴۲ھ کی بات ہے میری طالب علمی ہی کا زمانہ تھا ہمارے وطن سنبھل کے "مدرسۃ الشرع" کی طرف سے خاصے بڑے پیمانے پر ایک جلسہ ہوا اس میں جماعت دیوبند کے اس وقت کے اکثر اکابر علماء (مثلاً حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ) نے شرکت فرمائی تھی۔ حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ بھی تشریف لائے تھے مدرسہ کے مہتمم اور جلسہ کے منتظمین کی اجازت سے ایک دن دوپہر کے وقت کھانے کا انتظام میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے یہاں کیا تھا جلسہ گاہ اور ان حضرات کی قیام گاہ سے ہمارے مکان کا فاصلہ ایک میل سے کچھ زیادہ تھا اس لیے سب مہمانوں کو سواری کے ذریعے لانے کا انتظام کیا گیا تھا اور سب حضرات سواری ہی سے آئے لیکن حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کیا کہ سنبھل کے اپنے ایک پرانے شاگرد اور نیاز مند کو بہ طور راہنما ساتھ لے کر خاموشی سے ہمارے گھر پیدل تشریف لائے حالاں کہ موسم گرم تھا اور بارہ بجے کے بعد کا وقت تھا اور جیسا کہ عرض کیا گیا فاصلہ میل بھر سے بھی زیادہ تھا۔

سنبھل کے اسی سفر میں ہمارے یہاں کے ایک صاحب نے جو بچارے علمی، دینی، دنیوی کوئی بھی خاص حیثیت نہیں رکھتے تھے اور حضرت مولانا سے ان کا کوئی تعارف بھی نہیں تھا حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے درخواست کی کہ میرے گھر پر چل کر چائے پیجیے۔ مجھے یاد

ہے کہ ان کی یہ بات سب کو کچھ عجیب سی معلوم ہوئی، لیکن مولانا نے بغیر عذر دعوت کے قبول فرمالیا اور ان کے ساتھ ان کے گھر پر جاکر بالکل بے وقت چائے اور صرف چائے پی لی۔
ایک عجیب واقعہ اور سنیے۔ حضرت کے ایک شاگرد نے خود اپنا یہ واقعہ بیان کیا کہ حضرت ریل سے سفر فرما رہے تھے اور یہ صاحب خادم کی حیثیت سے حضرت کے ساتھ تھے انھیں استنجا کا تقاضا ہوا بیت الخلا کا دروازہ کھولا تو اس کو بہت غلیظ اور گندہ دیکھ کر واپس آگئے اور اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد حضرت مولانا تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھے اور بیت الخلا میں داخل ہو کر اندر سے دروازہ بند کرلیا۔ چند منٹ کے بعد تشریف لائے اور اپنے ان خادم سے کہا کہ اب چلے جاؤ۔ انھوں نے جاکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ حضرت ان کی واپسی کی وجہ محسوس کر کے بیت الخلا صاف کرنے ہی کے لیے اندر تشریف لے گئے تھے اور جب لوٹے بھر بھر کے بہت سا پانی بہادیا اور اس کو صاف کر دیا تو باہر تشریف لائے۔ کچھ حد ہے اس تواضع اور بے نفسی کی؟

کئی سال پہلے کی بات ہے حضرت کے ضعف پیری اور بعض دوسری اہم مصلحتوں کی بنا پر حضرت کے چند نیاز مندوں نے (جن میں یہ عاجز بھی شامل تھا) باہم مشورہ کر کے ایک دفعہ حضرت سے عرض کیا کہ حضرت آپ صرف وہ سفر فرمایا کریں جس کی کوئی خاص ضرورت اور اہمیت ہو اور یہ جو ہو رہا ہے کہ لوگ معمولی معمولی مقامی ضرورتوں اور جلسوں کے لیے حضرت کو تکلیف دیتے ہیں اور حضرت قبول فرمالیتے ہیں (اور اس طرح ہر ہفتے میں جمعہ کے ایک دن کا سفر تو ضروری ہوتا ہے)، یہ سلسلہ اب بند فرمادیا جائے۔ حضرت نے فرمایا میں کیا کروں لوگ آجاتے ہیں اور اصرار کرتے ہیں۔ عرض کیا گیا کہ اگر حضرت طے فرمالیں کہ اس سلسلے کو بند کرنا ہے تو تھوڑے عرصے تک تو ایسا ہو گا کہ لوگ آئیں گے اور حضرت کے انکار فرما دینے پر مایوس واپس چلے جائیں گے اس کے بعد عام طور سے لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ حضرت نے اب یہ فیصلہ فرمایا ہے تو پھر اس غرض سے لوگ آیا بھی نہیں کریں گے۔ فرمایا مجھ سے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ کے بندے آئیں اور وہ کہیں چلنے کے لیے اصرار کریں اور میں انکار پر جما رہوں۔ عرض کیا گیا کہ حضرت کی صحت اور حضرت کا وقت بہت قیمتی ہے اس کو صرف ضرورت اور موقعے ہی پر صرف ہونا چاہیے۔ حضرت نے خاکساری اور تواضع میں ڈوبے ہوئے لہجے میں فرمایا آپ لوگ یہ کیا کہتے ہیں! میں کیا ہوں اور میری کیا قیمت ہے یہ مٹی کا جسم ہے

جب تک چل رہا ہے اس سے کام لینا چاہیے۔

عزیمت یا شدت فی امر اللہ:

حضرت مولانا میں جہاں تواضع اور خاکساری اس درجے کی تھی جس کا اُوپر کی سطروں میں ذکر ہوا وہیں بظاہر اس کے بالکل برعکس یہ بات بھی تھی کہ جس راستے پر چلنے کو وہ حق سمجھ لیتے پھر کسی کا گھٹانا، کسی کا ساتھ دینا یا ساتھ نہ دینا، کسی کی رضامندی یا ناراضگی کسی کی تحسین یا ملامت حتیٰ کہ کوئی زلزلہ اور بھونچال بھی ان کو اس راستہ سے ہٹا نہیں سکتا تھا____ اس کی سب سے روشن مثال ان کا سیاسی مسلک اور اس سلسلے کی ان کی سرگرمیاں ہیں۔

ہندوستانی سیاسیات کے بارے میں ایک رویہ کو صحیح سمجھ کر اُنھوں نے اپنا لیا تھا جو لوگ دس بارہ سال پہلے کے واقعات بھولے نہیں ہیں اُنھیں یاد ہوگا کہ مولانا کو اس راہ میں کیسے کیسے ناموافق حالات اور کتنے سخت طوفانوں کا مقابلہ کرنا پڑا اور عزت و آبرو تک کی کیسی کیسی قربانیاں دینی پڑیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ جس دور میں جتنی زیادہ مخالفت بڑھی حضرت مولانا کو اس زمانے میں اتنا ہی زیادہ مضبوط، غیر متزلزل اور پُر جوش پایا گیا۔ اس سیاسی میدان میں حضرت مولانا کے ساتھ علما اور غیر علما میں اور بھی بہت سے تھے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ حضرت مولانا کی شان اس معاملے میں بالکل نرالی تھی وہ جب کسی نجی مجلس میں بھی اس موضوع پر بات کرتے تھے تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ انھیں اپنے راستہ کا ایسا یقین ہے اور وہ اتنے یکسو ہیں کہ دوسرے پہلو کو سُننے اور سوچنے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں اور یہ کہ اس مسئلے کا تعلق ان کے دماغ سے کہیں زیادہ ان کے قلب اور ان کی روح سے ہے یہ میں نے ایک ایسے مسئلہ کی مثال دی ہے جس میں حضرت مولانا کی عزیمت اور شدت کا تجربہ قریب قریب پورے اسلامی ہند نے کیا تھا اس کے علاوہ زندگی کے دوسرے دائروں میں بھی بہت سی ایسی مثالیں یاد ہیں کہ حضرت مولانا نے جس چیز کو حق اور جس رویہ کو اپنے لیے صحیح سمجھ لیا پھر ان کے خاص معتمد اور نیازمند بھی ان کا رویہ بدلوانے اور رُخ موڑنے کی کوششوں میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ اِلّا یہ کہ رائے ہی میں کوئی تبدیلی ہو جائے یہاں صفائی سے یہ بھی عرض کر دینے کو جی چاہتا ہے کہ ایسی ناکامیابی کا تجربہ ایک سے زیادہ دفعہ خود راقم سطور کو بھی ہوا ہے۔

ایثار و فیاضی اور مہمان نوازی:

ناظرین نے ایثار و فیاضی کے بہت سے نمونے دیکھے ہوں گے خود اس عاجز نے بھی دیکھے ہیں لیکن حضرت مولانا کی ذات میں اس کا جو نمونہ دیکھا اس کی مثالیں تو پچھلی تاریخ کی کتابوں میں بھی بہت کم ہی مل سکیں گی۔

مولانا کا دولت خانہ ایک ایسا وسیع مسافر خانہ یا مہمان خانہ تھا کہ جن لوگوں کو خود کبھی مولانا کا مہمان بننے کا اتفاق نہیں ہوا وہ کسی دوسرے سے اس کا حال سن کر صحیح اندازہ نہیں کر سکتے — بیسیوں دفعہ کے اپنے مشاہدے اور تجربے کی بنا پر میرا محتاط اندازہ ہے کہ برسہا برس سے مولانا کے یہاں مہمانوں کا اوسط چالیس پچاس روزانہ سے کم نہ رہتا تھا۔ ان میں ایک خاص تعداد تو ان اہلِ طلب کی ہوتی تھی جو حضرت سے بیعت ہونے کے لیے دور و قریب کے مختلف مقامات سے روزانہ آتے تھے ان کے علاوہ ایک تعداد ان لوگوں کی ہوتی تھی جو صرف زیارت و ملاقات کے لیے یا کسی معاملے میں دعا کی درخواست کے لیے یا اپنی کسی ضرورت میں حضرت مولانا کی سفارش حاصل کرنے کے لیے یا ایسے ہی کسی اور کام سے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور ایک دو دن رہ کر واپس چلے جاتے تھے ان کے علاوہ کچھ حضرات وہ بھی ہوتے تھے جو ذکر و شغل اور روحانی تربیت کے لیے کئی کئی مہینے حضرت کی خدمت میں مقیم رہتے تھے۔

میرا خیال ہے کہ مہمانوں کی ان قسموں کے علاوہ کچھ لوگ حضرت مولانا کی اس فیاضی اور مہمان نوازی سے بے جا فائدہ اٹھانے والے بھی ہوتے تھے میں نے واقفین سے سُنا ہے کہ قرب و جوار کے دیہات کے بعض لوگ جو بازار، تھانے یا تحصیل کے اپنے کاموں سے دیوبند آتے تھے وہ بھی کھانے کے وقت حضرت کے مہمان بن جاتے تھے اور حضرت ان کی اس نوعیت سے واقف ہونے کے باوجود ان کی مہمان نوازی کرتے تھے بلکہ خادموں تک کو سخت تاکید تھی کہ اگر کسی کے متعلق ایسا اندازہ ہو تب بھی مہمانوں کی طرح اس کا اکرام کیا جائے۔

مجھے حضرت کے ایک خادم نے خود بتایا کہ ایک دفعہ انھوں نے ایسے ایک صاحب سے کچھ کہہ دیا تو حضرت ان پر سخت غصہ ہوئے اور یہاں تک فرمایا کہ میرے یہاں آنے والے کسی بھی مہمان کا جو شخص دل دکھائے گا میں اس کو معاف نہیں کروں گا۔

بہر حال مختلف انواع واقسام کے ان مہمانوں کی تعداد کا اوسط جیسا کہ اس ناچیز نے عرض کیا چالیس پچاس روزانہ سے کم نہ تھا اگر کبھی صرف تیس پینتیس ہوتے تو اسی طرح کبھی ساٹھ ستر تک بھی ہو جاتے تھے۔

حضرت مولانا دونوں وقت مہمانوں کے ساتھ ہی بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے اور سب مہمان وہی کھاتے تھے جو خود حضرت کھاتے تھے۔

اگر کسی مخصوص مہمان کے اکرام میں کوئی خاص اہتمام اور تکلف کیا جاتا، مثلاً پلاؤ پکتا یا ثرید تیار کیا جاتا یا دیوبند کی مشہور فیرینی آتی تو بلا امتیاز سارے مہمان اس دن وہی کھانا کھاتے اور میرا خیال ہے کہ ہفتے میں ایک دو دفعہ ایسا ضرور ہوتا تھا۔

یہاں اس چیز کا ذکر دینا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ حضرت کے یہاں کا روزمرّہ کا سادہ کھانا بھی (یعنی روٹی اور آلو یا کسی ترکاری کے ساتھ بڑے گوشت کا شوربہ والا سالن) اس قدر لذیذ اور ذائقے دار ہوتا تھا کہ میں خود بھی شہادت دے سکتا ہوں اور بہت سے مہمانوں سے بھی میں نے سُنا ہے کہ حضرت کے دسترخوان پر بیٹھ کر سوایا یا ڈیوڑھا کھانا کھایا جاتا ہے اور کبھی نقصان نہیں دیتا۔

جو لوگ حضرت کے حالات سے کچھ باخبر ہیں اور جنھوں نے حضرت کی عجیب و غریب اور بے مثال مہمان نوازی کا تجربہ کیا ہے، ان کو اس میں شک نہیں ہو سکتا کہ روزمرّہ کی اس مہمان نوازی اور اسی طرح کی بعض دوسری للّہی مدوں میں حضرت کے ہاتھوں سے جو کچھ دوسروں پر خرچ ہوتا تھا خود اپنی ذات پر اور اہل وعیال پر اس کا چوتھائی بھی خرچ نہیں ہوتا ہوگا۔

کسی بندے کے ظاہری احوال و اعمال سے اس کے اندرونی حال کے بارے میں جہاں تک رائے قائم کرنے کا حق ہے اس کی بنا پر پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شُحّ اور حبِ مال سے حضرت کے قلب و روح کو ایسا صاف کر دیا تھا کہ شاید اس کے غبار کا کوئی ذرّہ بھی وہاں نہیں رہا تھا اور انشاءاللہ حضرت مولانا اس قرآنی بشارت کے خاص مستحقین میں ہوں گے۔ ومن یوق شُحّ نفسہٖ فاولٰٓئک ھم المفلحون ○ اور اللہ نے اپنے جن بندوں کو شُحّ اور حبِ مال کی بُری خصلت سے بچایا وہ فلاح پانے والے ہیں۔

ایک واقعہ اس جگہ اور بھی سن لیجیے جس سے حضرت مولانا کی اس خصوصیت (یعنی اثیار و فیاضی اور دوسروں کی راحت رسانی کا فکر و اہتمام) کے علاوہ ایسی ہی بعض اور خصوصیات بھی آپ کو معلوم ہوں گی۔

غالباً ۲۳ھ (یا ۲۴ھ) کی بات ہے سوامی شردھانند کی اٹھائی ہوئی شدھی سنگھٹن کی تحریک کے مقابلے میں "جمعیۃ العلماء ہند" کا شعبۂ تبلیغ میدان میں اترا ہوا تھا اُس وقت اس کے سامنے تبلیغی وفود کے ذریعے وقتی دفاعی کوششوں کے وہ اُن علاقوں میں جو شدھی تحریک کا خاص میدان بنے ہوئے تھے مذہبی مکاتب قائم کرنے کا ایک ٹھوس، مستقل اور وسیع کام بھی تھا جس کے لیے بہت بڑے سرمایے کی ضرورت تھی ــــ جمعیۃ العلماء ہند اور اکابر دیوبند سے تعلق رکھنے والے رنگوں کے صاحب خیر تاجروں نے اس سلسلے میں مالی امداد کا ایک منصوبہ تیار کیا اور جمعیۃ العلماء ہند سے اپنا ایک وفد برما بھیجنے کی درخواست کی۔ اس وقت برما ہندوستان ہی کا ایک صوبہ تھا ــــ یہ وفد رنگون پہنچا۔ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا احمد سعید صاحب (جو اس وقت جمعیۃ کے ناظم تھے) اس وفد کے ارکان تھے۔ مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب مرحوم بھی اس وفد کے ساتھ تھے لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے وہ اہل رنگون ہی کی دعوت پر دارالعلوم دیوبند کے شعبۂ تبلیغ کی طرف سے تشریف لے گئے تھے (شدھی سنگھٹن کے مقابلے میں دارالعلوم دیوبند کے شعبۂ تبلیغ کی طرف سے بھی مستقل کام ہو رہا تھا)

بہر حال یہ تینوں حضرات رنگون پہنچے ــــ صوبہ برما کے اس وقت کے انگریز گورنر نے یا اس کی ہدایت پر اس کے ماتحت کسی انگریز حاکم نے یہ حماقت کی کہ رنگون کے جن سورتی تاجروں نے ان حضرات کو دعوت دے کر بلایا تھا اور جو اس سلسلے میں پیش پیش تھے ان کو بلا کر اس نے کہا کہ آپ کے یہاں جو یہ تین عالم لوگ آئے ہیں ان میں ایک آدمی مولانا حسین احمد بہت خطرناک ہیں اور گورنمنٹ کے دشمن ہیں اس لیے ان کو ہم یہاں تقریر کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے، ان لوگوں نے کہا کہ اس وقت یہ وفد ایک بالکل دوسرے مقصد سے آیا ہے اس لیے اس کا کوئی شبہ بھی نہیں ہے کہ ان میں سے کوئی گورنمنٹ کے خلاف تقریر کرے۔ لیکن اس نے کہا نہیں ہمیں معلوم ہے کہ وہ بہت خطرناک آدمی ہیں اس لیے ان کو تقریر کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ بالآخر ان سورتی تاجروں نے (جو گورنمنٹ کی نگاہ میں بھی خاص وقار رکھتے تھے)

اس کی ذمہ داری لی کہ کوئی تقریر گورنمنٹ کے خلاف نہیں ہوگی۔ تب اس نے اجازت دی۔
ان بیچاروں نے یہ ساری بات حضرت کے سامنے بھی ذکر کردی۔ حضرت نے فرمایا
آپ نے اچھا نہیں کیا کہ مجھ سے دریافت کیے بغیر وعدہ کر آئے۔ یہ صحیح ہے گورنمنٹ
کے متعلق کچھ کہنے کا اس وقت میرا ارادہ نہیں تھا لیکن اَب مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ میں
تقریر کروں، اور واپس چلا جاؤں، لیکن رنگون کے وہ حضرات کسی طرح اس پر راضی نہ ہوئے،
آخر میں انھوں نے عرض کیا کہ آج حضرت کی تقریر تو ضرور ہوگی اور جو حضرت کا جی چاہے
وہی فرمائیں پھر جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا۔۔۔۔ لیکن حضرت مولانا اس خیال سے
کہ کہیں یہ بیچارے مشکلات میں مبتلا نہ ہوں برابر انکار فرماتے رہے آخر میں حضرت
مولانا مرتضیٰ حسن صاحب نے بھی ان کی سفارش کی تو بڑی مشکل سے حضرت اس بات
پر راضی ہوئے کہ آج تقریر فرما دیں گے لیکن اس کے ساتھ یہ شرط لگادی کہ اس کے
بعد میں کوئی تقریر نہیں کروں گا اور پہلے جہاز سے واپس چلا جاؤں گا۔ حضرت مولانا نے
(انھیں کی خیرخواہی کے لیے) اس شرط پر اتنا اصرار کیا کہ ان لوگوں کو بادل ناخواستہ ماننا پڑا۔
وقت آنے پر جلسہ شروع ہوا حضرت مولانا نے خطبۂ مسنونہ اور چند تمہیدی الفاظ کے
بعد تقریر اس طرح شروع فرمائی کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہاں کے گورنر صاحب نے
ہمارے محترم میزبانوں سے میرے بارے میں خطرے کا اظہار کر کے میری تقریر کو روکنا
چاہا تھا، اور وہ حضرات اپنی سادگی سے یہ وعدہ کر آئے کہ میں گورنمنٹ کے خلاف کچھ نہ
کہوں گا۔ مجھے ان کے اس وعدہ کا افسوس ہے لیکن اَب بہر حال مجھے ان کے وعدے
کی لاج رکھنی ہے، اگر وہ یہ وعدہ نہ کر آتے تو میں تفصیل سے بتاتا کہ گورنمنٹ مجھے کیوں
خطرناک سمجھتی ہے اور مجھے گورنمنٹ سے کیا شکایت ہے، میں بتاتا کہ گورنمنٹ نے
پوری اسلامی دنیا کو اور ہمارے ملک ہندوستان کو اور ہم ہندوستانیوں کو کتنا تباہ و
برباد کیا ہے ۔۔۔ بیان کرنے والے کا بیان ہے ۔۔۔ کہ قریباً ڈیڑھ گھنٹہ تک
مولانا یہی بیان فرماتے رہے کہ اگر ہمارے میزبان وعدہ نہ کر آتے تو میں یہ بتاتا اور
یہ بتاتا ۔۔۔۔ آخر میں فرمایا کہ چوں کہ ہمارے محترم میزبانوں نے گورنر صاحب سے وعدہ
کر لیا ہے کہ میں گورنمنٹ کے خلاف کچھ نہ کہوں گا اس لیے میں مجبور ہو گیا ہوں اور میں
اس سلسلے میں کچھ نہیں کہتا ۔۔۔ پھر چند کلمات وفد کے مقصد کے متعلق بھی کہہ کر تقریر
ختم فرمائی۔

حضرت مولانا اپنی شرط کے مطابق غالباً دوسرے یا تیسرے ہی دن بحری جہاز سے کلکتہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ حاجی داؤد ہاشم مرحوم نے (جو وقد کے خاص داعی اور میزبان تھے) اپنے خاص ملازم محمد ذاکر صاحب کو بطور خادم کے کلکتہ تک کے لیے حضرت کے ساتھ کر دیا۔ حضرت کا ٹکٹ فرسٹ کلاس کا تھا اور ذاکر صاحب کا ٹکٹ سرونٹ کی حیثیت سے تھرڈ کا تھا۔ حضرت مولانا کی سیٹ جس کمرہ میں تھی اس میں کوئی دوسرا مسافر نہ تھا اس لیے حضرت چاہتے تھے کہ ذاکر صاحب بھی زیادہ سے زیادہ وقت وہاں حضرت کے ساتھ رہیں لیکن جہاز کا "بوائے" جب آتا تو ذاکر صاحب کے ہر وقت وہاں رہنے پر معترض ہوتا، اس لیے حضرت مولانا نے یہ کیا کہ وہ خود زیادہ وقت تھرڈ کلاس میں ذاکر صاحب کے ساتھ گزارنے لگے۔ بہر حال سفر ختم ہوا اور چوتھے دن کلکتہ کا ساحل آگیا رواج کے مطابق "بوائے" فرسٹ کلاس کے مسافروں سے "انعام" یا "بخشش" مانگنے آیا۔ اگرچہ راستہ میں اس نے حضرت مولانا کو تکلیف دی تھی لیکن انعام مانگنے کے لیے وہ حضرت کی خدمت میں بھی حاضر ہوا، ذاکر صاحب بھی اس وقت ساتھ تھے انھوں نے عرض کیا کہ حضرت اس نے ہم لوگوں کو بہت تکلیف دی ہے اسے ایک پیسہ نہ دیجیے، لیکن مولانا نے ہنس کے فرمایا کہ نہیں ان کا حق ان کو ضرور دیا جائے گا ـــــ (آگے کی بات سننے سے پہلے یہ ذہن میں رکھ لیا جائے کہ یہ قصہ اس وقت کا ہے جبکہ ایک روپیہ آج کے ۷۔۸ روپے کے برابر تھا اس لیے جو لوگ بڑے سے بڑا انعام بھی بوائے کو دیتے تھے وہ زیادہ سے زیادہ ایک روپیہ ہوتا تھا) اس کے بعد سنیے کہ مولانا نے گن کر چار روپے نکالے اور اس کو دینے لگے وہ سمجھا کہ یہ مجھ سے مذاق کرتے ہیں اور اس طرح میری بد سلوکی کا انتقام لینا چاہتے ہیں، اس لیے اس نے ہاتھ نہیں بڑھایا۔ حضرت مولانا نے فرمایا: لے لو یہ تمہارے ہی لیے ہیں۔ آخر بہت جھجکتے ہوئے اس نے ہاتھ بڑھایا اور حضرت نے وہ روپے اس کو دے دیے۔ راقم سطور عرض کرتا ہے کہ خود محمد ذاکر صاحب نے مجھ سے بیان کیا کہ میں نے حضرت سے عرض کیا کہ اس کم بخت نے تو حضرت کو اتنی تکلیف دی کہ خدمت کے لیے مجھے حضرت کے ساتھ بھی نہ رہنے دیا اور حضرت نے اُسے اکٹھے چار روپے دے دیے بڑے سے بڑا انگریز بھی ان لوگوں کو ایک روپیہ سے زیادہ نہیں

دیتا۔ حضرت نے فرمایا بھائی ڈاکر اصل بات یہ ہے کہ یہ بیچارہ سمجھتا تھا کہ انعام بس صاحب بہادروں سے ملتا ہے ہماری موروتوں سے اُسے کچھ ملنے کی اُمید نہیں تھی اسی لیے اس نے ہمارے ساتھ ایسا برتاؤ کیا۔ اب ہمارا سفر تو ختم ہوگیا۔ میں نے یہ روپے اُسے اس لیے دیے ہیں کہ اسے معلوم ہو کہ ہم جیسے لوگ انگریزوں سے زائد دے سکتے ہیں۔ اَب مجھے اُمید ہے کہ ہماری ایسی صورت والے اللہ کے کسی بندے کو انشاء اللہ یہ آیندہ نہیں ستائے گا بلکہ اس کو آرام پہنچانے کی کوشش کرے گا۔ اسی ایک واقعے سے حضرت کی عالی ظرفی اور مزاج ایمانی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

—— بعض حدیثوں میں اللہ کے خاص مقبول بندوں کی یہ نشانی بتائی گئی ہے کہ انھیں دیکھ کر اور ان کے پاس بیٹھ کر خدا یاد آتا ہے —— اس یاد کے لیے جس ایمانی مناسبت اور جس توفیق کی ضرورت ہے جو لوگ اس سے محروم ہیں ان کا تو ذکر نہیں لیکن جن کو اللہ نے اس خیر سے محروم نہیں کیا ہے ان میں سے جس کو بھی حضرت سے قریب ہوتے اور خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا ہوگا یقین ہے کہ اس کو اس کا تجربہ ضرور ہوا ہوگا کہ ان کے پاس بیٹھ کر یا ان کو دیکھ دل میں خدا کی یاد اور آخرت کی فکر پیدا ہوتی تھی —— خود اپنے بارے میں صفائی سے عرض کرتا ہوں کہ بہت سے اُمور میں میری رائے حضرت سے متفق نہیں ہوتی تھی۔ اور رائے میں خاصا بُعد ہوتا لیکن جب خدمت میں حاضری ہوتی تو یہ یقین تازہ ہو جاتا کہ یہ اللہ کے خاص الخاص بندوں میں سے ہیں اور مجھ جیسوں کے لیے ان کی جوتیاں صاف کرنا اور قدموں کا غبار جھاڑنا بھی سعادت ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کی روح پر رحمتیں نازل فرمائے اور اُن کے اِن ایمانی اوصاف کے ورثے سے ہم کو محروم نہ رکھے۔

(ماہنامہ الفرقان۔ لکھنؤ۔ جنوری ۱۹۵۸ء)

—— • —— • ——

شیخ الاسلام کی ہمہ گیر شخصیت

مولانا قاری سعید الرحمٰن صاحب کیملپوری

تقسیم ملک کے بعد ہم نے جو قیمتی اور تاریخی اثاثہ ہندوستان میں چھوڑا ہے اس پر رہتی دنیا تک ہم حسرت و افسوس کریں گے۔ ہمارے مقدس مآثر اکثر ہند میں ہیں علم و فضل کی شعاعیں چونکہ ہند ہی کے بعض خطوں سے پھوٹی ہیں اس لیے ہمارا گراں مایہ علمی متاع وہیں رہا۔ مآثر میں آپ دیکھیں تو دنیائے اسلام کی عظیم ترین ہستیاں سرزمین ہند میں محو آرام ہیں، دنیائے تصوف کے تاجدار معین الدین اجمیری، تجدید دین کے علمبردار مجدد سرہندی، اولیا کے سردار نظام الدین اولیا، ہندوستان کو حدیث سے روشناس کرانے والے شاہ ولی اللہ، انقلاب ۱۸۵۷ء کے ہیرو مولانا محمد قاسم اور مالٹا کے اسیر حضرت شیخ الہند محمود حسن عالم اسلام کی یہ سب مقتدر ہستیاں ہند کی سرزمین میں محوِ آرام ہیں اور اپنے متعلقین اور محبین کو دعوتِ فیض عام دے رہی ہیں۔

اس کے علاوہ علمی مآثر میں ہم نے بہت سے قیمتی سرمایوں کو وہاں چھوڑا۔ دیوبند کا دار العلوم جو انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد اسلام کا عظیم الشان مرکز بن گیا، جس کی شعاعیں نہ صرف ایشیا بلکہ پوری دنیا پر پڑنے لگیں اور جس کے فیض سے آج خطہ ارض کا بڑا حصہ مستفیض ہو رہا ہے، سہارنپور کا مظاہر علوم جو دیوبند ثانی کی حیثیت رکھتا تھا لکھنو کا ندوۃ العلما جس کی علمی و ادبی قدروں سے آج ہم فائدہ حاصل کر رہے ہیں، علی گڑھ کا کالج جو سرسید کی امیدوں کا مرکز تھا یہ سب کچھ ہم نے تقسیم کے بعد ہند میں چھوڑ دیا۔ یہی چیزیں ایک قوم کی اہم سرمایہ ہوتی ہیں جو اسلاف ان کے لیے چھوڑ جاتے ہیں۔

فاضل مضمون نگار اس وقت دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک ضلع پشاور میں تھے۔ حکومت پنجاب کے وزیر مذہبی امور بھی رہے ہیں۔

زندہ ہستیوں میں ہم نے بعض ایسی شخصیتیں چھوڑی تھیں جو اپنی خدمات، علم وفضل، اور زہد و تقویٰ کے اعتبار سے نہ صرف پاک و ہند بلکہ پورے عالم اسلام میں اہم حیثیت کی مالک تھیں. یہ الگ چیز ہے کہ ہم میں سے بہت سوں نے ان کی قدر نہ پہچانی اور یہی مسلم قوم کی بدقسمتی ہے کہ وہ اپنے رہنماؤں کو صحیح طریقے سے نہیں پہچانتی وہ صرف بعض وقتی اختلافات سے ان کی خدمات بھول جاتی ہے۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ ان ہی شخصیتوں میں سے تھے جو پورے عالم اسلام میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے بیک وقت متعدد اوصاف کے حامل تھے۔ سیاسیات کے عظیم ماہر، پیکر زہد و تقویٰ، علم و فضل کے مجسمہ، پیغمبرانہ سیرت اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی زندہ مثال، ہر پہلو سے آپ عجیب کشش رکھتے تھے، سیاستداں آپ سے سیاست کا سبق سیکھتا، علم دین کا طالب، آپ کے علم سے بہرہ اندوز ہوتا، تصوف و تقویٰ کا جویا آپ کے زہد و تقویٰ اور خدارسی سے اپنی پیاس بجھاتا تھا۔ بہرحال ہر شخص اس چشمۂ فیض سے کچھ نہ کچھ حاصل ہی کرتا۔

ہم جیسوں کے لیے یہی امر باعث سعادت تھا کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر کم از کم آنکھوں سے زیارت کرلی۔ خوش قسمتی سے اگست ۱۹۵۵ء میں ہندوستان جانے کا اتفاق ہوا۔ ہندوستان جانے کی زیادہ تر وجہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت ہی تھی وہاں جاکر معلوم ہوا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ حج کو تشریف لے گئے ہیں اور ابھی تک واپس تشریف نہیں لائے۔ ہم آپ کے انتظار میں کچھ دنوں کے لیے دہلی میں مقیم ہو گئے۔ ایک دن صبح کو مولانا مفتی عتیق الرحمان صاحب کی خدمت میں ندوۃ المصنفین دہلی کے دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ فون پر ان کو اطلاع آئی کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ شام کی گاڑی میں بمبئی سے تشریف لا رہے ہیں۔ یہ سن کر دل کو عجب سرور حاصل ہوا۔ مقررہ وقت پر ہم بھی دہلی اسٹیشن پر حاضر ہوئے۔ دہلی اسٹیشن پر عجیب سماں تھا مسلمانوں کا ایک عظیم اجتماع اپنے رہنما کو خوش آمدید کہنے کے لیے آیا ہوا تھا۔ ہر ایک کے دل میں ایک جوش تھا ایک خلوص تھا ایک عقیدت تھی، ہر ایک حضرت شیخ کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بیقرار تھا۔ ہم اس سوچ میں تھے کہ خدایا یہ کیا عالم ہے ہم نے بہت سے لیڈروں اور علما کے استقبال کا منظر دیکھا ہے، مگر یہ کیفیت کہیں نظر نہ آئی۔ دراصل وہ عظمت جس کی آبیاری عقیدت و حقیقت سے ہو اس پر کبھی خزاں نہیں آتی بلکہ اس میں سدا بہار رہتی ہے جن کی عزت دلوں کی گہرائیوں میں جاگزیں ہوتی ہے ان کو اختلاف کی باد صرصر اور نامساعد حالات کے جھونکے گزند نہیں پہنچا سکتے۔ آپ تاریخ کے صفحات کو اُلٹیے

انہی رہنماؤں کے کارنامے ملیں گے جن کی بنیاد وقتی نعروں اور ہنگاموں پر نہ تھی بلکہ وہ حقیقی عزت و عظمت اور بلند کردار کے مالک تھے وہ اسی بنا پر حضرت مدنی کی یادیں آج صرف زبانیں ہی مرثیہ خواں نہیں بلکہ قلوب بھی غم میں بریاں ہیں۔

دہلی اسٹیشن پر آپ کا قیام صرف گاڑی ٹھیرنے تک رہا دو دن دہلی میں قیام کے بعد ہم کو دیوبند حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا حضرت چوں کہ نئے نئے حج سے تشریف لائے تھے اس لیے متعلقین ومحبین کا ایک تانتا بندھا ہوا تھا جو دور دراز سے آئے ہوئے تھے بہرحال ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اہل اللہ کے روزمرہ معمولات کس قدر زیادہ ہوتے ہیں اور وہ کیسی مصروف زندگی گزارتے ہیں حضرت شیخ الاسلام کی زندگی مجموعہ کرامات تھی آپ صرف گوشہ نشین اور خلوت پسند بزرگ نہ تھے بلکہ ساری عمر عملی جدوجہد ایثار وقربانی اور سیاسی انہماک میں گزری تھی۔

دیوبند میں چند روزہ قیام کے دوران ہم نے بچشم خود مشاہدہ کیا کہ آپ کی حیاتِ طیبہ کتنی مصروف ومشغول تھی ہم کو زیادہ تر عصر کے بعد عمومی مجلس میں بیٹھنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ طلبہ دارالعلوم اور باہر سے آئے ہوئے مہمانوں کے ہجوم میں آپ بیٹھے رہتے جگہ کی تنگی کی وجہ سے اکثر حضرات کو کھڑے ہونے کی نوبت آتی۔ طلبہ سے آپ کی شفقت ومحبت کا یہ عالم تھا کہ ہر ایک طالب علم بغیر روک ٹوک کے اپنی درخواست پیش کرتا ہم روز دیکھتے کہ عصر کے بعد اپنی جیب سے طلبہ دارالعلوم کی درخواستوں کا ایک بنڈل نکال کر حسب ضرورت، کارروائی فرماتے یہ چوں کہ ابتدائے سال کا وقت تھا اس لیے زیادہ درخواستیں امداد اور اجرائے طعام کے بارے میں ہوتیں۔ واقفین کو یہ معلوم ہوا کہ دارالعلوم کے آئین کے مطابق شیخ الحدیث کو اسپیشل اختیارات سے امداد جاری کرانے کا حق ہوتا ہے۔

چوں کہ ابھی تعلیمی سال کا آغاز ہی تھا اس لیے ہم نے بخاری شریف کے افتتاحی سبق میں شرکت کو اپنے لیے نعمت غیر مترقبہ سمجھا افتتاحی درس میں دارالعلوم کے اکثر طلبہ ومدرسین شریک ہوئے دارالحدیث گویا علم دین اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے پروانوں سے بھرا ہوا تھا آپ نے افتتاحی خطبہ میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور ان کی کتاب "الجامع الصحیح" پر ایک مفصل تبصرہ فرمایا گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک یہی سلسلہ چلتا رہا دورانِ درس میں آپ بلا اختیار عربی میں تقریر شروع فرما دیتے۔ کیوں نہ ہو آخر جس نے جوانی میں نبی عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے روضۂ اقدس کے سامنے بارہ سال

یک متواتر درسِ حدیث دیا ہو وہ کیوں نہ آخری عمر میں پہلی یاد تازہ کرتا ہوگا ہم نے اپنے لیے یہ بھی باعثِ فخر سمجھا کہ حضرت سے آخری دور میں ایک گونہ شرفِ تلمذ حاصل کرلیا۔

آپ اکثر اپنے مکان کے قریب چھوٹی مسجد[1] میں نماز ادا فرماتے۔ مسجد میں گنجایش نہ ہونے کی وجہ سے اکثر لوگوں کو باہر کھڑا ہونا پڑتا ان ایام میں ایک بنگالی طالب علم اس مسجد میں امامت کراتے تھے ایک دفعہ مغرب کی نماز میں امام نے "سورۃ القارعہ" پڑھی تلفظ اور قرأت صحیح نہ ہونے کی وجہ سے القارعہ کو القاریہ پڑھا سلام پھیرنے کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو تنبیہ کی اور تعریضاً و تعلیماً فرمایا کہ القاریہ! قاری کی بیوی کیا ہوتی ہے! یعنی قاریہ قاری کی مؤنث ہے۔

کاش! اس منبع خیر و برکت کے ساتھ رہ کر اور زیادہ فیوضیات حاصل کرسکتے،

"خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را"

(روزنامہ الجمعیۃ۔ دہلی، ۲۷ر اپریل ۱۹۵۸ء)

---

[1] اب یہ مسجد "مدنی مسجد" کے نام سے مشہور ہے۔ جدید تعمیر نے اس میں گنجائش بھی زیادہ پیدا کردی ہے اور حسن میں بھی اضافہ ہوگیا ہے۔ خاکسار کو اس مسجد میں کئی وقت کی نماز ادا کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ (ابوسلمان شاہجہان پوری)

مولانا حسین احمد مدنی

مولانا شاہ غلام حسنین ندوی

ریاست بہار میں میں تنہا شخص ہوں جس نے مولانا حسین احمد مدنیؒ کی وہ یادگار تقریر سُنی تھی جس کی پاداش میں ان پر اوران کے رفقا مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا نثار احمد کانپوری، ڈاکٹر کچلو اور پیر غلام مجدد سندھی پر کراچی کا تاریخی مقدمہ چلا تھا۔ اب سے ۴۸۔۴۹ سال ہوئے جب کہ کراچی میں آل انڈیا خلافت کمیٹی کا مشہور و معروف اجلاس زعیم ملت مولانا محمد علی کے زیر صدارت منعقد ہوا تھا۔ ان کی صدارتی تقریر اور کڑک دار آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔

ان ماخوذین پر انگریزی حکومت کی طرف سے یہ الزام تھا کہ انھوں نے اپنی تقریروں میں مسلمان فوجیوں کو بغاوت پر اکسایا تھا۔ اس مقدمہ کی کارروائی لاکھوں مسلمانوں کی طرح میں بھی ہر روز دلی تڑپ کے ساتھ پڑھا کرتا تھا جس آواز کو حکومت نے دبانا چاہا تھا یہی مقدمہ اس کی ہزار گونہ زیادہ اشاعت کا سبب بن گیا۔ مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ نے اپنا جو بیان تحریری عدالت میں پڑھ کر سُنایا تھا اس کا مضمون ہنوز میرے ذہن میں محفوظ ہے اپنی تقریر کو جس کی پاداش میں یہ ماخوذ تھے مزید قوت کے ساتھ مشرح کر دیا تھا مولانا نے اپنے اس بیان میں آیہ کریمہ مَن يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا پیش کرتے ہوئے اس کی تفسیر اس طرح کی تھی کہ جو شخص کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کرے گا تو اللہ نے اس کے لیے پانچ سزائیں مقرر کی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ جہنم میں جائے گا، دوسرے یہ کہ وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا تیسرے یہ کہ اللہ کا اس پر غضب ہوگا چوتھے یہ کہ اللہ کی اس پر لعنت ہوگی اور پانچویں یہ کہ اس پر بڑا عذاب ہوگا۔

سجادہ نشین خانقاہ سلیمانیہ، پھلواری شریف، پٹنہ

مولانا کا اشارہ ان فوجیوں کی طرف تھا جنھوں نے انگریزوں کے مفاد کی خاطر اسلامی ممالک میں جاکر اپنے مسلمان بھائیوں پر گولیاں چلائیں اور جن کی مدد سے اس وقت تک اسلامی ممالک پر انگریز اپنا پنجہ گاڑے ہوئے تھے۔

مولانا مدنی اپنا بیان پڑھتے ہوئے جب اس مقام پر پہنچے جس میں اُنھوں نے فرمایا تھا کہ "حمایت اسلام" کی خاطر جس وقت جان دینے کا موقع آئے گا تو سب سے پہلے میں اپنی جان پیش کروں گا" اس وقت مولانا محمد علی جوہر نے اپنی کرسی سے اُٹھ کر مولانا مدنی کا قدم چوم لیا۔ اس مقدمے کا جو فیصلہ ہوا اور ان اعاظم کو دو دو سال قید و بند کی جو مشقتیں برداشت کرنی پڑیں اس کا حال سب ہی جانتے ہیں۔

مقدمہ کراچی کے ایک عرصے بعد ۱۹۲۳ء میں جب کہ ترک موالات کی تحریک سرد پڑ جانے کے بعد آنجہانی مسٹر سی آر داس، پنڈت موتی لال نہرو، اور حکیم اجمل خان مرحوم نے مل کر کانگریس کے اندر ایک سوراج پارٹی قائم کی اور مجالس قانون ساز کا مقاطعہ بند کر دینے کا مشورہ دیا اور اس کے برخلاف جمعیت علماء ہند نے اپنے اجلاس منعقدہ گیا میں کونسلوں کے داخلے کو ناجائز قرار دیا تو ایک موقع پر چند گھنٹوں تک میرا اور مولانا حسین احمد صاحب مرحوم کا ساتھ رہا۔ مولانا موصوف کو شمالی بہار سے واپس ہوتے ہوئے پٹنہ سے صبح کی پنجاب میل پکڑنی تھی جس کے لیے شب بھر پٹنہ میں قیام کرنا تھا مولانا کو اپنے اُستاد بھائی اور بے تکلف دوست مولانا محمد سہول صاحب مرحوم پرنسپل مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کے ساتھ ٹھہرنا تھا مگر ان کے سرکاری مدرسے میں ایک باغی سرکار کا ٹھہرانا مناسب نہ تھا اس لیے مولانا حکیم رشید النبی دیسنوی مرحوم کے مکان میں مولانا مدنی کو ٹھہرایا گیا مولانا سہول اور حکیم صاحب مرحوم نے گاڑی بھیج کر میرے برادر بزرگ مولانا شاہ حسین میاں صاحب مرحوم کو اور مجھ خاکسار کو بُلوا لیا تاکہ باہمی مذاکرہ و لطف کے ساتھ یہ وقت گزرے۔ مجھے یاد ہے کہ مولانا سہول نے دورانِ گفتگو میں کہا کہ داخلہ کونسل کو ممنوع قرار دینے کا نتیجہ ہی کیا ہوگا اور کہاں اس فتوے کی شنوائی ہوگی۔ مولانا مدنی نے فرمایا کہ مولانا عبد الحیٔ صاحب (فرنگی محلی) نے بہت سے فتوے ایسے دیے کہ جن کو لوگوں نے نہیں مانا تو کیا فتویٰ دینے میں وہ خاطی تھے ایسے ہی ہم بھی اگر شرعاً کسی چیز کو ناجائز سمجھتے ہیں تو اس کا اعلان کرنے سے کیوں پرہیز کریں۔

شب بھر ہم لوگوں نے وہیں قیام کیا چند گھنٹوں کی ملاقات و گفتگو کے بعد مولانا کے کردار کا ایک نمایاں تاثر میرے قلب پر یہ ہوا کہ میں نے اس دور کے عام علمائے کرام و مشائخ عظام

ومقتدایان دین کے برعکس انھیں بالکل منکسر المزاج، ملنسار، بے تصنع و بے تکلف پایا انھوں نے کوئی ایسا موقع نہ آنے دیا کہ مجلس میں ان کا کوئی امتیاز خاص نمایاں ہونے پاتے میں نے محسوس کیا کہ یہ عام انسانوں کے ساتھ مل جل کر عام انسانوں ہی کی طرح رہنا پسند کرتے ہیں۔ قائد کارضا کارانہ زندگی گزارنا ہی اس کا کمال ہے۔

اس ملاقات کے بعد مولانا کو ۱۱ ربیع الاول ۱۳۴۲ھ کو میں نے اپنے گھر پر دیکھا جب کہ وہ چند گھنٹوں کے لیے مولانا محمد سجادؒ کی دعوت پر پھلواری اُتر پڑے تھے وہ حضرت والدی (مرشدی) علیہ الرحمۃ سے بھی ملنے آئے اور لب فرش بیٹھ گئے باوجود اصرار تکرمہ کے قریب نہ گئے۔

جون ۱۹۲۵ء کا واقعہ ہے کہ میں برادر گرامی حضرت شاہ محی الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ سجادہ نشین خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف سے ان کی خلوت میں مولانا حسین احمد مدنیؒ کی سادگی و منکسر المزاجی کا ذکر کر رہا تھا اس پر اخی محترم نے اپنے کسی معتقد کا نام لیا (جو مجھے اب یاد نہیں ہے) کہ ان کو ایک بار کلکتہ میں مولانا حسین احمد مرحوم کے ساتھ کئی دن تک ایک ہی کمرہ میں قیام کرنے کا اتفاق ہوا وہ ہر روز صبح کو اُٹھتے تو لوٹوں میں تازہ پانی بھرا ہوا پاتے اپنا بستر یوں ہی چھوڑ کر کام پر چلے جاتے تھے دوپہر کو کھانے کے لیے آتے تو بستر قرینے کے ساتھ بچھا ہوا پاتے اور لوٹے پانی سے بھرے ہوتے۔ ان کو گمان تھا کہ صاحبِ خانہ کا ملازم یہ سب خدمتیں انجام دے دیتا ہے لیکن بعد میں متحقق ہوا کہ یہ سب مولانا حسین احمد مدنی کر دیتے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ کسی دن صبح کی نماز کا وقت آخر ہونے لگتا تو جگانے کے لیے مولانا اپنے ہاتھوں سے ان کے پیر دابنے لگتے۔ حضرت بھائی مرحوم نے اس طرح کے ایک دو واقعے اور بھی بیان کیے۔

ایک فاضل اور عظیم المرتبت مدرس ہونے کی حیثیت سے مولانا حسین احمد مرحوم کے تلامذہ کی تعداد اس وقت برصغیر کے سبھی علما سے زیادہ ہے اس کے ساتھ ساتھ بیعت وارشاد کے لحاظ سے بھی غالباً اُس وقت کے وہ سب سے زیادہ وسیع الحلقہ پیر تھے۔ اربابِ حکومت و اقتدار کے نزدیک ان کا جو مرتبہ تھا اس کا اندازہ ان کی وفات پر تعزیتی پیغامات و نشریات سے کیا جا سکتا ہے۔ ان عظمتوں کے باوجود وہ معمولی انسانوں کی طرح زندگی گزارتے تھے۔ سادہ رہائش اور سادہ طور وطریقہ تھا، دربار داری سے دُور تھے۔ وضع و قطع میں تصنع نہ تھا اور نہ عام سطح انسانی سے اپنے کو بلند رکھنے کی سعی و فکر میں اپنے کو پریشان کرتے تھے وہ عام مسلمانوں کے درمیان بغیر گاؤ تکیہ کے بیٹھنے میں عار نہ محسوس کرتے تھے وہ عوام کی مجلسوں میں بلا تکلف شرکت کرتے تھے

کیا اس دور کے پیروں اور پیرزادوں کے لیے اور اپنے کو "نحن ورثتہ الانبیاء" کہنے والے واعظین و علماء کے لیے اس میں کوئی سبق نہیں ملتا؟

انقلاب، حکومت اور آزادی ہند کے بعد اگر مولانا چاہتے تو اپنی گزشتہ سیاسی خدمات کے بہت بڑے بڑے صلے حاصل کر سکتے تھے ان کے ہندو مسلمان رفقائے کار میں کون ہے جو متمتع نہ ہوا ہو لیکن مولانائے مرحوم کی زندگی جو پہلے تھی وہی اب بھی رہی حتیٰ کہ "پدم بھوشن" کا اعزازی تمغہ بھی قبول نہ کیا۔

بہت سے کارکنوں نے جب وہ اپنی طلب کے مطابق مناصب حاصل کرنے میں ناکام ہوئے تو احزابِ مخالف میں سے کسی نہ کسی پارٹی میں شرکت کر لی لیکن مولانا اس وقت بھی ایک اِنچ نہ بدلے۔ جب طلبۂ دارالعلوم پر پریس نے بوچھار کی اور خود مولانا کے مسکن کی سرچینگ کی گئی۔

ان کی زندگی کی اس یکسانیت نے ان کے کٹر مخالفین کو بھی یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ مولانا نے جو سیاسی راہ عمل اختیار کی تھی وہ ان کے ضمیر کی آواز تھی نہ کہ ذاتی منفعت و اعزاز کے لیے خلاف ضمیر خوشامد جس سے ان کی ذات کہیں بلند تھی۔

(ہفتہ روزہ صداقت، پٹنہ، ۳ رمئی ۱۹۵۸ء)

. . . : . .
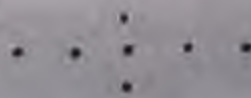
خانقاہ عظمت اسلاف

شیخ المشائخ سید الطائفہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی

محمد وارث کامل بی، اے

ولی اللّٰہی مدرسۂ خیال کے پیرو علما کا سرخیل زیادہ موزوں الفاظ میں سید الطائفہ اس دور میں اگر کوئی تھا تو صرف دارالعلوم دیوبند کا شیخ الحدیث اور جمعیۃ علماء ہند کا صدر گرامی قدر جسے برصغیر ہند و پاک کے باشندے ہی نہیں بلکہ بیرونی ممالک کے افراد بھی شیخ المشائخ حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے نام نامی اور اسم گرامی سے یاد کرتے ہیں۔

۵ دسمبر ۱۹۵۷ء مطابق ۱۲ جمادی الاول ۱۳۷۷ھ کو اس شخصیت والا مرتبت کا حادثۂ ارتحال ایک ایسا عظیم سانحہ ہے جسے صدیوں تک فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

شہرۂ آفاق مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ بقید حیات تھے تو ان کی صورت و سیرت کے آئینہ میں ولی اللّٰہی سلسلہ کے تمام ارباب علم و فضل اور اصحاب اصلاح و تقویٰ کی چلتی پھرتی اور بولتی چالتی تصویریں نظر آتی تھیں۔ گویا مولانا اپنی ذات سے ایک انجمن، ایک ادارہ، ایک موتمر، ایک مجلس اور ایک محفل تھے۔ ملاقاتی آپ سے ملتے تو نگاہوں کے سامنے کچھ ایسا سماں بندھتا کہ مولانا تنہا نہیں ہیں بلکہ علماء و مشائخ کا ایک جم غفیر مولانا کی شخصیت کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

راقم الحروف تو بلا مبالغہ یہ بات بھی کہہ سکتا ہے کہ صحابہ، تابعین، تبع تابعین، اور اتباع تبع تابعین کی برگزیدہ شخصیتوں میں جو فضائل و کمالات پوشیدہ تھے ان کی جھلک شیخ الہند مولانا سید حسین احمد مدنی کی سیرت میں نظر آتی تھی۔

سوانحی خاکہ:

مولانا کی ولادت کی تاریخ ۱۹ شوال ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۹ء ہے آپ ضلع اناؤ کے

سابق ایڈیٹر مدینہ بجنور۔ بعد میں کامل مرحوم پاکستان آ گئے تھے اور ہفت روزہ چٹان کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ہو گئے تھے۔ کچھ زمیندار کے ایڈیٹر بھی رہے۔ حضرت کا انتقال ہوا تو یہ لاہور میں تھے۔

قصبہ بانگرمئو میں تولد پذیر ہوئے آپ کا آبائی وطن موضع الہ داد پور تحصیل ٹانڈہ ضلع فیض آباد ہے آپ کا سلسلۂ نسب شہید کربلا امام حسین رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ حسینی سادات کا یہ خاندان جس کے چشم و چراغ اس دور میں حضرت مولانا تھے انیس پشت پیشتر ہندوستان میں آکر آباد ہوا تھا مولانا کے پدر بزرگوار حضرت مولانا سید حبیب اللہ شیخ المشائخ حضرت مولانا فضل الرحمن گنج مرادآبادی کے خلفا میں سے تھے۔ مولانا کی والدہ ماجدہ بھی زہد و تقویٰ کا مجسمہ تھیں مقدر کی بات ہے کہ حبیب اللہی خاندان کے سُوت سے پانچ دریا نکلے۔

(۱) مولانا محمد صدیق جو اپنے دور کے صاحب کمال عالم باعمل تھے۔ یہ مجاہد بھی تھے جنگ جرمنی ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء میں ترکی حکومت کے زیرِ حراست اپڈریانوپل میں مقیم رہے وہیں آپ کی وفات ہوئی موصوف نے مدینہ منورہ میں دینی و ملی خدمات بھی انجام دیں۔

(۲) مولانا سید احمد جن کی کوششوں سے مدینہ طیبہ کے حرم اطہر میں مدرسۃ الایتام کا قیام عمل میں آیا یہاں شرعیات و دینیات کی تعلیم کے پہلو بہ پہلو صنعت و حرفت کی تعلیم بھی دی جاتی تھی ۱۳۶۰ھ میں آپ کا وصال ہوا۔

(۳) خود مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ۔

(۴) مولانا سید محمود احمد صاحب جو غالباً بقید حیات ہیں کچھ عرصہ پیشتر جدہ میں قاضی تھے مدرسۃ الایتام انہی کی تحویل و نگرانی میں ہے۔

(۵) مولانا سید جمیل احمد جو کافی عرصہ پہلے انتقال فرما چکے ہیں۔

حضرت مولانا حسین احمد مدنی ابتدائی تعلیم سے فراغت کے بعد جو انھوں نے اپنے والد ماجد سے حاصل کی ۱۳۰۹ھ میں جب کہ ان کی عمر ۱۲ سال تھی دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے یہاں آپ کی خوش نصیبی سے آپ کو شیخ الہند محمود حسن ایسا شفیق و رفیق استاد ملا۔ شیخ الہند فارغ اوقات میں بھی اپنے تلمیذ کی تعلیم و تربیت فرماتے تھے اس معتبر معلم کو اپنے خورد سال متعلم سے اتنا تعلق خاطر تھا کہ جیسے کسی شفیق باپ کو اپنی اولاد سے ہوتا ہے۔ شاگرد بھی ہو تو پھر ایسا نیاز مند کہ ایک دفعہ حضرت شیخ الہند کے یہاں کسی نے فرمائش کی کہ بھنگی سے نالی صاف کرادو بھنگی تو ملا نہیں مگر نالی صاف بھی ہوگئی اور دُھل بھی گئی۔ بعد میں پتا چلا اور وہ بھی حضرت شیخ الہند کے خادم مولانا محمد جلیل کیرانوی کے ذریعے کہ نوجوان شاگرد حسین احمد

نے اپنے ہاتھوں سے کیچڑ صاف کیا ہے اسی قسم اور اسی نوعیت کی خدمتیں تھیں جن کے طفیل مولانا چند سال ہی میں کہیں سے کہیں پہنچ گئے۔

علوم متداولہ سے فراغت کے بعد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے ۱۳۱۶ھ میں جب مولانا کے والد ماجد نے مع افرادِ خاندان بیت اللہ شریف کا قصد فرمایا تو پیرو مرشد نے اپنے صالح مُرید کو یہ ہدایت کی کہ وہ مکہ معظمہ میں حضرت مولانا حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی خدمت بابرکت میں چندے حاضر باش رہ کر منازل سلوک طے کریں چنانچہ ایسا ہی ہوا مولانا چند ماہ حضرت مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے فیوض و برکات سے بہرہ اندوز ہوئے۔ اس قلیل ترین مدت میں حضرت مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سعادت آثار نوجوان پر اپنی خصوصی توجہات مرکوز کیں اور یہی چاہیے بھی تھا حضرت مہاجر مکی سے زیادہ کون اس حقیقت سے باخبر ہوگا کہ کل اس کے پر تو سے ہزاروں غبار آلود قلب جلا پائیں گے۔

دینی خدمات مدینہ منورہ میں:

شروع شروع میں مولانا نے مدینہ منورہ میں ایک مدرسہ میں ملازمت کی تھی لیکن تھوڑے دنوں بعد اس اندازِ تعلیم سے آپ کی طبیعت اُچاٹ ہوگئی آپ نے متوکلاً علی اللہ مفت تعلیم دینی شروع کی۔ مسجدِ نبوی آپ کی درسگاہ تھی اس درس گاہ کی حیثیت علوم نبویہ کے چشمۂ فیض کی سی تھی دس سال تک مصر و شام، فلسطین و یمن، تیونس و افغانستان اور ایران وغیرہ کے تشنگانِ علم اس چشمے سے سیراب ہوئے روزانہ بارہ ۱۲ گھنٹے مولانا کے علم کا بحر مواج ٹھاٹھیں مارتا رہتا۔

اقتصادی مشکلات کا مقابلہ بڑی پامردی اور بڑے ثبات سے کیا شروع میں ایک دوکان کی لیکن اس سے اتنی یافت نہ ہو سکی کہ پورے خاندان کی گزر اوقات ہو سکے آخر کار آپ نے اُجرت پر کتب عربیہ کی نقل کا کام نہایت تندہی سے شروع کیا اس زمانے میں مدینہ طیبہ میں چند قدیم کتب خانہ تھے ان میں نایاب قلمی کتب کا اچھا خاصا ذخیرہ تھا باذوق اربابِ علم جو دیگر ممالک سے آتے وہ بسا اوقات قلمی کتب کی نقول لے جاتے تھے۔

پیر طریقت حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی طلبی پر ۱۳۱۶ھ میں پہلی بار مولانا عازمِ ہندوستان ہوئے اس موقع پر پیرو مرشد نے آپ کو خرقۂ خلافت مرحمت کیا۔ دوسری بار ۱۳۲۶ھ میں

مولانا ہندوستان آئے اور مسلمانانِ ہند کی اس انقلابی تنظیم (موتمر) میں حصہ لیا جو شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن کی زیرِ قیادت موتمر الانصار کے نام سے ہندوستان میں قائم ہوئی تھی مولانا عبیداللہ (سندھی) موتمر کے ناظمِ اعلیٰ تھے۔ رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم اور مولانا ابوالکلام آزاد کی ہمدردیاں اس تنظیم سے وابستہ تھیں۔

اس موتمر کے سالانہ اجلاس مختلف مقامات پر ہوتے تھے چنانچہ دیوبند، مراد آباد اور میرٹھ میں اس کے جو سالانہ اجلاس ہوئے ان کی حیثیت تاریخی ہے۔ اس موتمر نے جنگِ بلقان کے زمانے میں قابلِ قدر خدمات انجام دیں یہی وہ موتمر تھی جس کے کارکنوں پر برطانیہ کے خلاف سازش کا الزام عائد کیا گیا۔ ریشمی رومال کی تحریک میں اسی موتمر کے کارکن پیش پیش تھے۔

مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان میں دو سالہ قیام کے بعد پھر عازمِ حجاز ہو گئے۔ مدینہ منورہ میں پھر آپ کے دینی و علمی مشاغل کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ موتمر انصار کے رکن اور اعلیٰ کارکن کی حیثیت سے آپ کی ذمہ داریوں میں پہلے کی بہ نسبت کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا ۱۳۳۳ھ میں آپ چند ماہ کے لیے پھر ہندوستان آئے تھے۔

سیاسی جدوجہد:

۱۳۳۳ھ میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن بھی عازمِ حجاز ہوئے فراغتِ حج بیت اللہ کے بعد ۱۳۳۴ھ میں آپ نے مدینہ منورہ میں حاضری دی اسی سال جمال پاشا اور انور پاشا بھی زیارت کے لیے مدینہ منورہ پہنچے۔ شیخ الہند اور مولانا سے ان ہر دو حضرات کی ملاقاتیں ہوئیں ان ملاقاتوں کا منشاء انگریز دشمنی تھا حالات یہ پیش آئے کہ شریف مکہ نے برطانیہ کی خوشنودی کی خاطر ترکوں کے خلاف اپنے علما سے فتویٰ تیار کرایا اور یہ چاہا کہ شیخ الہند بھی اس پر اپنے دستخط فرمائیں۔ لیکن حضرت نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ اس انکار کی پاداش میں ۲۳ر صفر ۱۳۳۵ھ کو شیخ الہند اور ان کے رفقاء انگریزوں کی تحویل میں دیدیے گئے۔ مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ بھی اپنے استاد جلیل کے ہمراہ پابجولاں تھے انھی ایام میں مولانا کے والد ماجد اور برادرانِ محترم کو بھی کچھ غلط اطلاعات کی بنا پر ایڈریانوپل میں نظربندی کی مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ چنانچہ مولانا کے والد ماجد اور مولانا کے برادرِ بزرگ مولانا صدیق احمد ایام نظربندی ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے صرف یہی نہیں بلکہ مولانا کی اہلیہ محترمہ اور لختِ جگر بھی جو مدینہ طیبہ میں رہ گئے تھے انقلابی مصائب و آلام کے شکنجے میں پھنس کر جاں بحق تسلیم ہوئے۔

مالٹا کی اسیری:

جدہ میں ایک ماہ گزارنے کے بعد ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ کو یہ نظربند استاد و شاگرد مصر پہنچے، وہاں سے ۲۲ ربیع الاول کو انھیں شومزلایا گیا جہاں سے دو ڈیڑھ درجن گوروں کی مسلح گارڈ کی حراست میں انھیں قاہرہ پہنچا دیا گیا۔ قاہرہ سے نیل کے دوسرے کنارے پر واقع جیزہ کے جیل خانہ میں انھیں محبوس کر دیا گیا اگلے دن ان کے بیانات قلم بند کیے گئے۔ ۲۳ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۵ فروری ۱۹۱۶ء کو مالٹا روانہ کیے گئے۔ ۲۱ فروری ۱۹۱۶ء کو مالٹا پہنچے۔ اس اسارت گاہ میں تقریباً تین ہزار قیدی تھے جن میں تقریباً نصف جرمنی تھے باقی آسٹرین، بلغاری، ٹرکی، مصری، شامی وغیرہ۔ مولانا نے حفظ قرآن کی دولت اسی اسارت گاہ میں حاصل کی آپ کی غیر محدود معلومات کا ذخیرہ بھی اسی اسارت کا حاصل ہے۔

۲۲ جمادی الثانی ۱۳۳۶ھ کو حضرت شیخ الہند اور ان کے رفقاء کی رہائی کے احکام صادر کیے گئے۔ یہ وہ دور تھا کہ ہندوستان میں تحریک خلافت اور تحریک استخلاص وطن کا آغاز ہو چکا تھا لہٰذا مولانا بھی اپنے استادِ محترم کے ہمراہ ہندوستان چلے آئے۔

ہندوستان میں سیاسی سرگرمیاں:

۱۹۱۹ء میں تحریک خلافت کی بنیاد پڑ چکی تھی شیخ الہند اور ان کی معیت میں مولانا بڑی گرم جوشی سے اس تحریک میں شریک تھے شیخ الہند کی عمر نے وفا نہ کی اور وہ ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء کو دہلی میں رحلت فرما گئے۔

مولانا کے کاندھوں پر شیخ الہند کی جانشینی اور مسلمانانِ ہند کی سربراہی کا بوجھ آ پڑا۔ ۸۔ ۹۔ ۱۰ جولائی ۱۹۲۱ء میں بہ مقام کراچی آل انڈیا خلافت کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا اس کانفرنس میں حضرت مولانا مدنی نے ایک تجویز پیش کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ

> "موجودہ حالات میں مسلمانوں کے لیے سرکاری فوج میں ملازم رہنا یا بھرتی ہونا یا دوسروں کو بھرتی کی ترغیب دینا حرام ہے اور ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ یہ بات فوجی مسلمانوں کے ذہن نشین کر دے۔"

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸ ستمبر ۱۹۲۱ء کو مولانا کی گرفتاری عمل میں آئی رئیس الاحرار مولانا محمد علی اور بعض دوسرے حضرات بھی اس سلسلے میں ماخوذ تھے اس مقدمہ کی کارروائی تفصیل طلب

ہے صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ خالقِ دینا ہال کراچی میں مقدمہ کی سماعت کا سلسلہ شروع ہوا ۲۸ر ستمبر ۱۹۲۱ء کو مولانا محمد علی کا بیان سُنا گیا۔ دوسرے دن ۲۹ر ستمبر کو حضرت مولانا مدنی کے بیان کی نوعیت آئی اس بیان کے چند جملے یہ ہیں:

"اگر مذہبی فرائض کا لحاظ و احترام نہ کیا گیا تو اس صورت میں کروڑوں مسلمانوں کو اس مسئلہ کا تصفیہ کر لینا چاہیے کہ آیا وہ مسلمانوں کی حیثیت سے زندہ رہنے کو تیار ہیں یا حکومت برطانیہ کی رعایا کی حیثیت سے؟ اگر گورنمنٹ مذہبی آزادی چھیننے پر آمادہ ہے تو مسلمان اپنی جان تک قربان کر دینے کے لیے تیار ہوں گے اور میں پہلا شخص ہوں گا جو اپنی جان قربان کروں گا۔"

آخری چند الفاظ پر رئیس الاحرار مولانا محمد علی نے حضرت مولانا کے قدم چوم لیے۔ کون نہیں جانتا کہ یہ الفاظ ایک ایسے شخص کی زبان سے نکل سکتے ہیں جو صحیح معنی میں مجاہدِ وطن تھا۔ ۱۹۲۳ء میں جمعیۃ علماء ہند کا پانچواں اجلاس کوکناڈا میں ہونے کو تھا اس کی صدارت کے لیے حضرت مولانا منتخب ہوئے غرض دو سال کی قید و بند سے رہائی کے بعد مولانا نے اپنے خطبۂ صدارت میں انھی خیالات کا اعادہ کیا جن کی بنا پر ان کی گرفتاری عمل میں آئی تھی مثلاً فرمایا کہ

"ضروری فرض یہ ہے کہ ہم نہایت شدومد سے پورے عزم و استقلال کو کام میں لاتے ہوئے انگریز کی ناپاک پالیسی کا مقابلہ کریں۔"

۱۹۲۳ء کے بعد حضرت مولانا نہایت خلوص اور نیک نیتی سے تحریک آزادی میں گرم جوشی کے ساتھ حصہ لیتے رہے تا آنکہ تقسیم کا مرحلہ پیش آگیا ظاہر ہے کہ مولانا قیام پاکستان کے حق میں نہیں تھے لیکن انھوں نے قیام پاکستان کے بعد جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس بمبئی میں جو خطبۂ صدارت دیا تھا اس کے ایک جملے سے نیک نیتی اور خلوص کا اظہار ہوتا ہے مثلاً آپ نے فرمایا:

"ہماری خواہش یہی ہے کہ انڈین یونین اور پاکستان کے تعلقات خوش گوار اور زیادہ مضبوط ہوں"

دارالعلوم دیوبند کی صدارت:

حضرت مولانا انور شاہ کاشمیری کے استعفیٰ کے بعد ۱۳۴۶ھ میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی سے درخواست کی گئی کہ وہ دارالعلوم دیوبند کی صدارت قبول فرمالیں۔ چند مصالح

کی بنا پر آپ نے اس درخواست کو شرف قبول بخشا۔ لیکن ان شرائط کے ساتھ کہ

(۱) سیاسی خدمات پر کوئی پابندی نہ ہوگی۔
(۲) دارالعلوم کی جانب سے سیاسی اُمور میں کوئی خلل نہ ہوگا۔
(۳) ہر مہینے میں ایک ہفتہ کی رخصت ہوگی تاکہ سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لیے دیوبند سے باہر دوسرے مقامات کا سفر کیا جا سکے۔
(۴) ایک ہفتہ سے زائد اگر رخصت لی گئی تو اس پر تنخواہ وضع کی جائے گی۔

آپ کے شب و روز کے مشاغل کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ اس کے تصور سے وحشت طاری ہوتی ہے۔ سیاسی تبلیغی، اور تدریسی تینوں قسم کی خدمات آپ سے متعلق تھیں۔ مزید برآں دارالعلوم دیوبند کی صدارت کے لیے منصبی فرائض یعنی خصوصی مشورے، تعلیم کی نگرانی، چندہ کے لیے کوشش، مالیات کی ترقی وغیرہ بیک وقت ادا کرنا درحقیقت حضرت مولانا ہی کا حوصلہ تھا۔ آرام آپ کو کبھی نصیب نہیں ہوا۔

حضرت مولانا کی زندگی مسلسل جدوجہد کی زندگی تھی اکثر ایسے اتفاقات ہوئے ہیں کہ دات کو کسی مقام پر کئی گھنٹے مسلسل تقریر کی ہے اس کے بعد پھر سفر کی زحمت گوارا کرلی رات کا بقیہ حصہ اس کی نذر ہوگیا، صبح ہوئی تو درس و تدریس میں اس بلا کا انہماک کہ سر کھجانے کا ہوش نہیں گرچہ اس بے پناہ مصروفیت میں آپ کو تصنیف و تالیف کا وقت نہیں ملتا تھا تاہم جب بھی اسلامی اور سیاسی نقطۂ نظر سے کوئی اہم اور دشوار مسئلہ پیش آجاتا تو آپ کا قلم حرکت میں آتا اور شبہات و اشکالات کی چادریں سرکتی چلی جاتیں۔

جمعیۃ علمائے ہند:

جمعیت علمائے ہند کی داغ بیل اگرچہ حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور حضرت علامہ مفتی کفایت اللہ ڈال چکے تھے لیکن اس نقشے میں رنگ، حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے استادِ محترم شیخ الہند نے بھرا مالٹا سے واپسی پر آپ کی شب و روز کی مصروفیات میں جمعیت علمائے ہند کی خدمات، بھی داخل تھیں۔ جمعیت علمائے ہند کے اجلاس جونپور سنہ ۱۹۴۰ء میں آپ کو جمعیت علمائے ہند کی صدارت سونپی گئی آپ کے خطبات صدارت جو جونپور لاہور، سہارنپور اور دیگر مقامات پر منعقدہ کانفرنسوں میں پڑھے گئے۔ علمی، تاریخی اور سیاسی اعتبار سے دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں۔

معمولات ومشاغل:

آپ کے معمولات کا سلسلہ تین بجے، رات کے پچھلے پہر سے شروع ہو کر رات کے ۱۲ بجے تک جاری رہتا سال کا تقریباً نصف حصہ بلکہ اس سے بھی زائد سفر میں گزرتا ہر چند کوشش کی گئی کہ آپ کی ان مصروفیات میں کمی ہو جائے لیکن ایسا نہ ہو سکا کسی کی دعوت کو مسترد کر دینا آپ کے لیے محال تھا سفر کے دوران میں بھی آپ کی نمازیں بالعموم باجماعت ادا ہوتی تھیں آخر شب میں تہجد اور ذکر وغیرہ کی مشغولیتیں بھی رہتیں۔

مہمان نوازی:

آپ کا دستر خوان ہمیشہ نہایت وسیع رہا۔ پندرہ، بیس مہمان عموماً آپ کے دستر خوان پر جمع رہتے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اگر رات کے ۱۱ بجے بھی مہمان آپہنچتا تو اس کے لیے اسی وقت کھانا تیار ہوتا۔

روزمرہ کا معمول:

دیوبند میں قیام کی صورت میں آپ کا پروگرام یہ ہوتا کہ آخر شب میں نماز فجر تک تہجد اور ذکر کے اشغال رہتے نماز فجر کے بعد تقریباً ایک گھنٹہ بعد تک تلاوت قرآن کریم اور مطالعۂ کتب بعد ازاں مہمانوں کی معیت میں چائے اور ناشتہ پھر تقریباً ۲ا بجے تک دارالعلوم میں درس اور اس کے ساتھ ہی پرنسپلی کے فرائض کی سرانجام دہی۔ اس کے بعد دوپہر کا کھانا تناول فرماتے تھوڑی دیر قیلولہ فرمانے کے بعد نماز ظہر ادا ہوتی پھر ڈاک دیکھتے مہمانوں سے گفتگو بھی ہوتی ان کی ضروریات بھی رفع فرماتے یہ سلسلہ نمازِ عصر تک جاری رہتا۔ عصر سے مغرب تک حدیث شریف کا درس دیتے نماز مغرب کے بعد تقریباً ایک گھنٹہ نوافل میں صرف ہوتا جس میں سوا پارہ یومیہ تلاوت فرماتے نوافل سے فراغت کے بعد مہمانوں کے ساتھ کھانا تناول فرماتے اور فوراً ہی نماز عشاء کی تیاری شروع ہو جاتی۔ نماز عشاء کے بعد تقریباً تین گھنٹے بخاری شریف کا درس جاری رہتا جس میں ہند اور بیرونِ ہند کے قریب قریب ڈھائی سو طلبہ شریک ہوتے۔

(ہفت روزہ چٹان لاہور۔ ۱۶ر دسمبر ۱۹۵۷ء)

شیخ الاسلام کی یاد

جمیل مہدی صدیقی

شیخ الاسلام مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے ۵ دسمبر ۱۹۵۷ء کو جسمانی طور پر اس دُنیا کو چھوڑ دیا اور قابلِ رشک حد تک آسودگی اور اطمینان کے ساتھ ان کی پاک روح واصل بحق اور داخل جناں ہو گئی۔ مسلمانوں میں خصوصاً اور ہندوستان کے اہلِ درد لوگوں میں عموماً ان کے وصال کو ایک بہت بڑے سانحے اور ایک بہت بڑے نقصان سے تعبیر کیا گیا اور ہندوستان کے کونے کونے میں افسردگی اور یاس کی تیز لہر دوڑ گئی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی وفات سے نقصان کا جتنا احساس مسلمانوں کو ہونا چاہیے اتنا نہیں ہے ہندوؤں میں بھی ان کی ذاتِ اقدس کے متعلق زیادہ تر بے پروائی اور بے خبری کے جذبات پائے جاتے ہیں، اس کی بڑی وجہ خود مولانا کی پیدا کردہ تھی۔ انھوں نے آدھی صدی تک ہندوستان کے طول و عرض میں بیداری کی بجلیوں اور بغاوت کے طوفان کی پرورش کی، اپنی تحریر، تقریر اور ذاتی اثرات و وجاہت غرض یہ کہ ہر ممکن طریقے سے ہندوستان کے لوگوں اور خصوصاً مسلمانوں کو غیر ملکی حکومت کے جوئے سے نجات پانے کی کوششوں کی جانب متوجہ کیا متواتر راتوں کو جاگ کر اور دنوں کو سفر کر کے انھوں نے مسلمانوں کے اعصاب اور حسیات میں فولاد پلانے کا کام جاری رکھا اور عمر عزیز کا بہتر حصہ ہندوستان کی آزادی اور مخلصی کا خواب دیکھتے ہوئے اس خواب کی تعبیر کے لیے جد و جہد کرتے ہوئے اور آتشیں اِمتحانات کی آگ میں جلتے ہوئے بسر کر دیا، لیکن کبھی وہ اس طرف متوجہ نہیں ہوئے کہ اپنی خدمات کی اہمیت سے دنیا کو آگاہ اور واقف کرا سکیں، انکسار اور فروتنی کے علاوہ قناعت اور بے نیازی ان کے مزاج میں اتنی زیادہ تھی جس نے انھیں ہمیشہ پُر ہیبت خطرناک لیکن مرنجان مرنج اور صلح کل اِنسان کے روپ میں پیش کیا ان کی ذات ایسی تھی کہ مخالف خوف کھاتے ہوئے بھی ان سے فائدہ اٹھانے کی جسارت

بے موقع نہیں سمجھتے تھے اور اِس میں اُنھیں اکثر کامیابی ہو جاتی تھی۔

انھوں نے زندگی بھر اس کی پروا نہیں کی کہ لوگ ان کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں بلکہ ہمیشہ بے نیازانہ وہ اپنی دھن میں لگے رہے اس احتیاط کے ساتھ لگے رہے کہ دُنیا تک ان کی جدوجہد اور اس کی اہمیت کا تذکرہ کم سے کم پہنچے۔ یہی وجہ تھی کہ ۱۹۴۷ء کے بعد ہر چند ان کے مخالفوں کی تعداد بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی لیکن چند مخصوص لوگوں کو چھوڑ کر پوری دنیا شیخ الاسلام کے ان معرکوں اور کارناموں سے غافل اور بے خبر تھی جن کی بنا پر شیخ الاسلام کے خطاب کا ان سے زیادہ مستحق ہندوستان میں کوئی دوسرا نظر نہ آتا تھا پھر ان مخصوص لوگوں میں بھی ہر شخص ان کی بے پناہ زندگی کا مکمل احاطہ نہیں کر سکتا تھا بلکہ اس زندگی کے بعض بعض ہی گوشے ان کی نظروں کے سامنے آ گئے تھے ——— خود شیخ کو بھی اپنی تمام جدوجہد، خدمت اور معاملات میں اپنی اہمیت کا زیادہ احساس نہیں تھا پھر کچھ بالقصد بھی اس معاملے میں وہ حد درجہ اخفاء اور احتیاط سے کام لیتے تھے اور اُنھیں لینا بھی چاہیے تھا کیوں کہ جس پائے کے وہ انسان تھے وہ تو خیر پایہ ہی اُٹھ ختم ہو گیا ہے لیکن جس معیار کو انھوں نے اپنے پیش نظر رکھا تھا اس کا تقاضا بھی یہی تھا کہ خود ان کے بجائے ان کی خدمت، جدوجہد اور مشن کے تعارف اور نشر و اشاعت کا کام دوسرے لوگ انجام دیں لیکن جن لوگوں کا یہ کام ہونا چاہیے تھا افسوس کہ وہ زندگی بھر مفاد پرستیوں اور خود غرضیوں کے اُلٹے اُلٹے طلسمات دکھلاتے رہے کہ انھیں شیخ الاسلام کی جدوجہد اور کارناموں کے بیان و اذکار کی اہمیت کا احساس کیا خاک ہوتا وہ ان کے کارناموں کو اپنے کارنامے اور ان کی جدوجہد کے مفید نتائج کو اپنی جدوجہد کے مفید نتائج کے نام سے دنیا کے سامنے پیش کر کے سگھڑ بھلائی لیتے اور اپنی لیڈری کو چمکانے کی نت نئی کوششوں سے ہی فرصت نہیں پاتے تھے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کی لیڈری تو شیخ الاسلام کے ساتھ ہی رخصت ہو گئی لیکن ان کی مذموم کوششوں کی بدولت جو نقصان مسلمانوں کو پہنچا، عوام اور مولانا کے درمیان جو دیوار کھڑی رہی، اُونچی ہوتی رہی اس نے یہ صورت پیدا کی کہ ان کے وصال کے بعد لوگ ان کا ماتم ایک مرشدِ کامل، ایک شفیق باپ ایک زیرک اور مخلص استاد، ایک دل سوز اور ہمدرد ساتھی اور محبت و تعلق سے بھرپور

ایک بزرگ کی حیثیت سے کرتے ہیں، ان کے بہتے ہوئے آنسوان کی اس جدائی کے احساس سے اور زیادہ تیز ہو جاتے ہیں جو اب کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے لیکن مولانا کے متعلق تشکر، امتنان، اور احسان کا وہ جذبہ نہیں نظر آتا جس کی بدولت ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد قابل ذکر حد تک باقی نظر آرہی ہے۔ اور یہاں کے عبادت خانے آباد اور کھلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

اگر تقسیم کے بعد مسلمان ہندوستان میں اور خصوصاً مغربی یوپی میں قائم اور برقرار رہ سکے اور وہ عظیم سازش جو انھیں ہندوستان سے مکمل طور پر بے دخل کرنے کے لیے انتہائی عروج پر پہنچی ہوئی تھی ناکام اور منہدم ہوئی تو صرف ایک آدمی کو اس کا کریڈٹ دیا جا سکتا ہے اور وہ تھے شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ۔

مولانا اس زمانے میں نہ صرف یہ کہ استقلال و استقامت کی ایک اٹل چٹان بنے رہے جس سے تمام مسلمان حوصلہ اور ہمت حاصل کرتے تھے بلکہ آگے بڑھ کر انھوں نے خاموش لیکن انتہائی قدم اٹھانے سے بھی پہلوتہی نہیں کی وہ جہاں ایک طرف فساد کے دنوں میں مسلمانوں کو ہندوستان میں پامردی کے ساتھ جمع رہنے کی تلقین کرتے رہے اور ان کے اس فعل کو دین اور دنیا کے فائدے کا حامل بتاتے رہے ہم لوگوں کے ساتھ مل کر بہ نفس نفیس رات رات بھر پہرہ دیتے رہے اور اس طرح اپنے متعلقین کے لیے اپنے عمل کو لائق پیروی ظاہر کرتے رہے وہاں دوسری طرف انھوں نے اس وقت کے وزیر اعلیٰ یوپی مسٹر گووند ولبھ پنتھ سے بھی انتہائی غضب ناک لہجے میں باز پرس کی اور مسلمانوں کے متعلق انتظامات کے ناکافی بلکہ منتظموں کے نااہل ہونے کے بارے میں بڑی بے قراری کا اظہار فرمایا۔

جب پنتھ جی نے ان کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ دارالعلوم کی حفاظت کے لیے فوج بھیج دی جائے تو انھوں نے بڑی بے پروائی لیکن مضبوط اور سخت لہجے میں انھیں جواب دیا "دارالعلوم تو خدا کا ہے وہ اس کی حفاظت خود کرے گا آپ سہارنپور کی خبر لیجیے۔ اگر آپ مسلمانوں کا تحفظ کرنے کے بارے میں مذبذب ہیں یا اس میں ناکامی کا اندیشہ ہے تو آپ مجھے اجازت دے دیں میں مسلمانوں سے کہہ دوں گا کہ وہ اپنا تحفظ خود کرلیں"

ان تہدیدی کلمات ہی کا نتیجہ تھا کہ سہارنپور کی انتظامی مشین چوبیس گھنٹے کے اندر

تبدیل کردی گئی اور مسٹر رامیشور دیال کلکٹر کو یوپی کی حکومت نے اختیارات دے کر بھیجا اور مسلمانوں میں نشاۃ الثانیہ کا دور شروع ہوا۔

اگر ۱۹۴۸ء میں مولانا کی ایک ذات، استقامت کی عظیم چٹان بن کر حوادث اور طوفان کے سامنے نہ جم جاتی تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ کا نقشہ کیا ہوتا ان کی زندگی مسلسل جد وجہد بھاگ دوڑ اور رست وخیز کی زندگی رہی ہے آزادی سے پہلے ان کی طوفانی رفتار کے مقابلے میں کانگریس کے بڑے بڑے بگولے پیچ و تاب کھا کر رہ جاتے تھے انھوں نے متحدہ قومیت کے نظریے کو جب سے اپنایا تھا آخر تک وہ ان کا عقیدہ بنا رہا ــ درمیان اور آخر میں یہ عقیدہ اشکالات اور ترغیبات کے ہجوم میں کچھ دیر گھر ضرور گیا لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس کی موجودگی اور ضیا میں کبھی کمی نہیں ہوئی انھوں نے ایک مسلمان رہنما کی حیثیت سے جہاں مسلمانوں کی اجتماعی حیثیت، ملی عظمت اور معیشت وسیاست کے متعلق سوچا، اقدامات کے متعلق غور وفکر کیا، ان کے سامنے اچھے برُے راستے کی پہچان پیش کی وہاں ایک قومی دردمند کی حیثیت سے ان کی ملکی خدمات عظیم الشان اور لازوال ہیں۔

ان کی شخصیت بڑی اہم شخصیت تھی ایک منکسر مزاج جھکے ہوئے سر کے نیچے وقار بے پناہ اثرات کا کتنا بڑا پہاڑ چھپا ہوا تھا اس کا اندازہ تو اسی وقت ہوتا تھا جب وہ کسی کام کو حد آخر تک پہنچانے کا عزم صمیم لے کر جد وجہد کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے، انھوں نے متحدہ قومیت کے بیج کی آبیاری اور پرورش اس وقت شروع کی جب مسلمانوں میں سیاست کا شجرِ ممنوع اور اس کے پاس جانا جرُم تھا اور جاگیرداروں کے بیٹے عوام کی بددعاؤں کا ہدف رہ کر بھی کونسل میں ان کی نمایندگی کے فرائض انجام دیتے تھے۔

تمام مسلمان معاشرہ میں نیم دلی اور ایسا ٹھیراؤ پیدا ہو گیا تھا کہ ہوا کا ہر جھونکا اس کے تعفن کو پھیلاتا تھا مگر اس زمانے کے مسلمان جاگیردار اُسے عطر کی لپٹیں کہہ کر مسلمانوں کو بھی اس کا یقین دلانے کی کوشش میں لگے رہتے تھے ۔ یہ مولانا اور ان ہی جیسے دوچار آدمیوں کی برکت تھی کہ انھوں نے اس ٹھیراؤ، تعفن اور جمود و پستی کے خلاف جد وجہد کی اور بالآخر میراث میں ملی ہوئی عظمت کے اس بت کو اس طرح توڑ کر رکھ دیا کہ اس کے باقی ماندہ پجاری اپنی بقا اور تحفظ کے لیے اب مولانا کے بتائے ہوئے لباس میں

چھپ کر ہی اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھ سکتے ہیں اور یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔

میں نے ابتداء میں کہا ہے کہ ان کی ملکی خدمات عظیم اور لازوال ہیں بہ ظاہر یہ ایک سیدھا سادہ اور رسمی سا جملہ ہے لیکن اس کے پیچھے مولانا کی کوہ وقار شخصیت کا کتنا پرتو اور ان کے لاانتہا اثرات کی کتنی کارفرمائیاں چھپی ہیں اس کا اندازہ تو اسی وقت ہو سکتا تھا جب کہ مولانا آزادی کے بعد اس کی کارفرمائی کو سامنے لانے کا ارادہ کر لیتے۔ کراچی جیل سے اپنے گھر کے کنج تنہائی تک ۔۔ (جو آزادی کی برکتوں کے طفیل انھیں پسند کرنی پڑی) ان کی زندگی ایک سیدھا سادہ خط مستقیم رہی، عمل اور عقیدہ کے اعتبار سے اس میں کبھی کوئی پیچ و خم کوئی لچک پیدا نہیں ہوئی لیکن خود ان کے دماغ و دل پر خارجی مشاہدے اور ظواہر کا کتنا اثر مرتب ہوا اور انھوں نے کتنے قیامت ناک اور درد انگیز جذبات و حسیات کے

اس وقت تو ان کی زندگی کا ایک اجمالی خاکہ پیش کرنے کا خیال ہے مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ جب ۱۹۵۲ء میں امرت بازار پتریکا میں ناموس رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ مذموم اور رسوائے عالم سلسلہ شروع ہوا جس کی موجودگی اب تک بھی کبھی نہ کبھی ظاہر ہو جاتی ہے تو شاید شیخ الاسلام سے زیادہ متاثر اور شدید طور پر دل شکستہ انسان اس وقت ہندوستان میں کوئی دوسرا نہیں تھا اس وقت ان کی حالت ایسے انسان کی تھی جس نے تمام عمر دانہ چن چن کر انبار اکٹھا کیا ہو اور جس وقت اس کے اعصاب کمزور اور چلنے کی طاقت مضمحل اور ناکارہ ہو چکی ہو اور وقت آگیا ہو کہ وہ اس تمام عمر کی کمائی سے فراغت اور اطمینان حاصل کرے تو دیکھا یک معلوم ہو کہ اس انبار میں آگ لگ چکی ہے۔

ایک لمحے کو تو وہ سکتے میں آ گئے لیکن دوسرے ہی لمحے ان کے ضعیف، کمزور اور بڑھاپے کے ہاتھوں لاچار جسم کے اندر وہ پرانا حسین احمد جاگ اٹھا جس نے عواقب اور نتائج سے بے پروا ہو کر ایک ایسی عظیم، ظالم اور استبداد کے کوڑوں سے مسلح حکومت سے ٹکر لی تھی جس کے حدود میں کسی وقت بھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا انھوں نے اس ضعیفی اور انحطاط کے زمانے میں بھی ایک عظیم الشان تحریک کے متعلق سوچا۔۔ سوچا اور اٹھ کر دار العلوم کے احاطہ میں ایسی تقریر کی کہ سارے ہندوستان کی فضاؤں میں چرچے اور بارود کی ملی جلی بدبو کا انتظار جاگ اٹھا۔ اس تقریر کا ہونا تھا کہ سارے ہندوستان کے سیاسی ایوان میں زلزلہ پڑ گیا، سرگوشیوں اور مشوروں کی لمبی قطاریں دکھائی دینے لگیں سازشوں اور حیلوں کے جال

بنے جانے لگے۔

پھر یہ واحد واقعہ نہیں ہے جو مولانا کی آزادی کے بعد کی زندگی میں پیش آیا۔ ایسے واقعات اور سانحے اکثر پیش آتے تھے جن کی بدولت مولانا کی دل شکستگی میں اضافہ ہوتا تھا، انھیں چرکے لگتے تھے اور وہ دل پکڑ کر اور ضبط کر کے بیٹھ جاتے تھے۔

ایک معمولی تھانیدار نے جس وقت دارالعلوم کے احاطہ میں گھس کر تلاشی لی، اور صدر کانگریس کی معیت میں جو ایک بڑی مسلمان شخصیت ہیں نہایت آمرانہ طرزِ عمل سے مدرسے کے منتظمین اور مدرسین کے ساتھ پیش آیا اور اس احاطے میں اس نے ہندوستان کی آزادی کی تذلیل و توہین کی جس کے تقدس اور وقار کو سر جیمس مسٹن کی غیر ملکی اور دشمن حکومت نے غلامی کے دوران بھی باقی رکھا تھا تو مولانا کے دل پر کیا گزری ہوگی کیسے کیسے خیالات و محسوسات اور جذبات و ہیجان کے طوفان ہوں گے جن سے انھیں نبرد آزمائی کرنی پڑے گی اس کے متعلق ہم اور آپ کیا اندازہ کر سکتے ہیں۔۔۔۔۔

پچھلی سطروں میں مولانا کی ذہنی اور قلبی کیفیات کا اجمالی تذکرہ میں نے محض اس لیے کیا ہے کہ ان کی آخری زندگی اور نقطۂ نظر کے متعلق ملک میں بڑی غلط فہمیاں اور الجھاؤ پایا جاتا ہے اور جو لوگ ان کے میلان، افتادِ طبع اور زندگی کی پاک نہادیوں کا بچشم خود نظارہ کر چکے ہیں انھیں بھی اس بارے میں کچھ حیرت سی ہوتی ہے حقیقت یہ ہے کہ آزادی کے بعد مولانا کے عمر بھر کے خوابوں کی جو تعبیر نکلی اور ملکی سیاست کا جو نقشہ سامنے آیا وہ ان کے نقطۂ نظر، میلانِ طبع اور خواہش کے قطعاً خلاف تھا، وہ ہندوستان میں جس فراخ دلی، خوش حالی ذہنی وسعت، اور رواداری سے بھرپور فضا کو دیکھنا چاہتے تھے وہ انھیں نہیں مل سکی۔

اس کے بجائے انھوں نے دیکھا کہ سیاست کے بازار میں بے ایمانیوں اور بے اصولیوں کی جنس سستی ہوگئی اور سعادتوں کا آفتاب، خود ان کے ہم قوم انسانوں پر اندھیروں کی بارش کرنے لگا، ان کی آرزو تھی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی خوش بختی اور آسودگی کا سویرا طلوع ہوتے دیکھ لیں لیکن جب انھیں اس کے آثار دور دور تک نظر نہ آتے تھے تو ان کا دل افسوس اور حسرت کے درد سے بھر جاتا تھا جب بھی انھوں نے سیاست کے اس نئے رخ اور طوفان کے ایک ہی سمت بہتے ہوئے دھارے کو کو روکنے کے لیے جد و جہد کا ارادہ کیا ان کے سامنے ایسی رکاوٹیں کھڑی ہوگئیں۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی اس خاموشی نے ہندوستان کی جتنی خدمت کی اور اس کا امن بنائے رکھنے میں جتنا عظیم حصہ لیا، حکومت کی جتنی امداد کی اور مسلمانوں کی ایک پورے دور کی پوزیشن اور حالت کو مستقبل کے مؤرخ کے مطالعہ کرتے ہیں جیسی مدد دی اس کا اندازہ آنے والے دنوں میں ہی ہو سکے گا۔ کہنے کو حسین احمد ایک آدمی کا نام تھا جو ہندوستان کے دستور کے مطابق انتخابات میں اپنی تنہا رائے ہی کا استعمال کر سکتا تھا لیکن اس ایک رائے کے پیچھے ایک کروڑ انسانوں کی ایک مضبوط صف تھی۔ ایک اشارہ پر بک جانے والے اور قربان ہو جانے والوں کا جیسا عظیم انبوہ تھا انقلاب برپا کر دینے والی جیسی طاقت تھی اس طاقت سے ملک کی حکمراں جماعت کتنی ہی ہمت اور امداد حاصل کرتی تھی، اس کا اندازہ تو مستقبل قریب میں ہی بہ خوبی ہو جائے گا۔۔۔۔

وہ اس دور کے آدمی نہیں تھے جہاں کامیابیوں اور کامرانیوں کو مکاریوں اور چالبازیوں کے بل پر حاصل کیا جاتا ہے اس لیے اس دور کے آدمی انھیں صحیح طور پر سمجھنے میں بہت دیر لگائیں گے، انھوں نے ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں اپنی جوانی اور زندگی کو بہ حقیقت ایندھن کی شکل میں جھونک ڈالا تو ان کا مقصد لیڈری اور رہنمائی نہیں تھا بلکہ مذہب اور ملک کے مقدس تقاضوں اور فرض کی بجاآوری میں وہ اس میدان میں اس وقت آئے تھے جب راتوں کی فرصت عزیز اور خوابوں کی لذت عزیز ہوتی ہے اور دنوں کا مصرف اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ جذباتی تسکین کی خاطر جاں سپاریوں کے لیے مواقع مہیا کیے جائیں۔

مالٹا کی اسارت کے دور سے لے کر جب کہ وہ نوعمر اور نوجوان تھے آزادی کے یوم سعید تک کہ ضعیفی اور بڑھاپے نے ان پر غلبہ پا لیا تھا انھوں نے آزادی کے سفر میں ایک ایک مرحلہ پر اپنی جانفشانی اور جدوجہد کا دوامی نقش بنایا تھا اور وطن و ملت کو ایک ایک قدم پر اپنا خون نذر کیا تھا اس لیے ان کا حق تھا کہ آزادی کے بعد ملک کے حکمران طبقے میں ان کی خواہش اور پسند کو ایک خاص درجہ دیا جاتا اور ان کے تھکے ہارے جسم کو منزل پر پہنچ کر کمر کھول لینے کی مہلت دے دی جاتی لیکن بڑی اذیت ناک بات یہی ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔

حکومت کے وزیر، اسمبلیوں کے ممبر، پارلیمنٹری ارکان اور اس جماعت کے ممتاز

افراد جس کی رگوں میں ان کا خیرات کیا ہوا خون دوڑتا تھا ان کے سامنے حاضر ہوتے تھے، مؤدب بیٹھتے تھے، ان کی دعائیں اور آشیرواد حاصل کرتے تھے، انکساری اور ہیچ مدانی کے سارے مظاہر ختم کردیے تھے، لیکن حقیقت کیا تھی تاریخ اس دردناک صورت حال کو نوٹ کرے کہ ہندوستان کی سیکولر حکومت اندرونی طور پر اپنے اس عظیم جرنیل سے نہ صرف نامطمئن اور فکرمند تھی بلکہ اس کی خوف زدگی کا یہ عالم تھا کہ انٹیلیجنٹ محکمہ کے معمولی ارکان کے ذریعہ ان کی نقل و حرکت کے تفحص اور جستجو کئے بغیر اسے قرار نہ آتا تھا۔

پھر یہ بات بھی نہیں تھی کہ شیخ الاسلام حکومت کی سول سروس اور ارباب بست و کشاد کے اس عجیب طرز عمل سے ناواقف اور بے خبر ہوں انھیں اس کا علم اچھی طرح تھا اسی لیے ان کے طرزِ عمل میں بیگانگی اور مغائرت کا ایسا عنصر آخری دور میں داخل ہوگیا تھا کہ افسران تو کجا بڑے سے بڑے وزیر اور ذمہ دار عہدیداران کے سامنے آتے ہوئے گھبرانے لگے تھے۔......

قومی جدوجہد اور کانگریس سے ان کا تعلق جنم بھر کا تھا اس لیے وضع داری اور عالی ظرفی کے طفیل اس کی شمولیت ترک کرنا اور چھوڑ دینا انھیں پسند نہیں تھا اور ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے کسی وقت بھی وہ امیدِ اصلاح کے امکان سے تہی دست ہونا گوارا نہیں کرتے تھے۔ اسی لیے جب بھی کبھی کوئی نازک وقت ایسا آتا تھا کہ ملک اور قوم کو ان کی آواز اور سہارے کی ضرورت ناگزیر حد تک پڑ جاتی تھی، وہ باوجود ناگوار احساس کے، باوجود انقباض اور دل گرفتگی کے، باوجود دل شکستگی اور دل برشتگی کے اس ضرورت کو لبیک کہتے تھے، باوجود ضعیفی اور کمزوری کے اس ضرورت میں ملک اور قوم کے کام آجاتے تھے۔!

ارباب انتظام کی ناعاقبت اندیشیوں، ذہن کی پستیوں اور ظرف کی شیوہ طرازیوں کی بدولت ہندوستان کی سیاست اور خصوصاً یوپی کی سیاسی صورتِ حال میں کتنی دور بڑے مایوسیوں اور تہلکہ خیزیوں کے آئے۔ ایسے دور آئے کہ دستوری اعتبار سے یہاں کی صورتِ حال کانگریس کے لیے یاس انگیز بن گئی اور ایسا ماحول پیدا ہوگیا کہ کم از کم مسلمانوں کا تعاون تو یہاں کی سرکاری مشینری کو حاصل نہیں ہوسکتا تھا اس وقت اگر ایک مولانا کی ذات مخالفتوں اور ستیزہ کاریوں کی آندھیوں کے درمیان ڈٹ کر کھڑی نہ ہوجاتی تو نہیں کہا جاسکتا کہ وقت کی درماندگیاں ابنائے حکومت اور گم نامیوں کے کون

ے اندھیروں میں بہالے جائیں لیکن ہندوستان کے اس سپوت نے، قوم کے اس جرنیل نے، مسلمانوں کے اس رہنما نے باوجود زخم خوردہ ہونے کے، باوجود دل تنگ اور پریشان ہونے کے اس تیکھے کو روکا اور اس طوفان کی کلائی مروڑ دینے میں اپنی آن اور پہاڑ جیسی شخصیت کو داؤ پر رکھ دیا۔ کتنے ہی موقعوں پر طوفان اور آندھیوں کا سارا زور انھوں نے اپنی نحیف اور ضعیف جان پر روکا اور جس قدر حکومت میں لوگوں کے مبارک بادیوں کے ہجوم اور تہنیتوں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی اس وقت وہ ایک ہستی بے نیازی کے ساتھ اپنے معبود کے سامنے عبادت کی تقدیس میں کھڑی ہو گئی جسے اس ساری کامیابی کا افتخار پہنچتا تھا اور جسے عین موقع پر نظر انداز کر دینے کی وقت کے رہنماؤں کو عادت ہو گئی تھی۔

زندگی ہی میں ان کی شخصیت کا آسمان پورے مسلمانوں کی عقیدت کے رابطے اور احترام کے جذبات پر مسلط ہو گیا تھا اور مسلمانوں کے لیے ان کی اواز آخری آواز اور ان کا مشورہ آخری حکم کا درجہ حاصل کر چکا تھا لیکن خود ان کا حال یہ تھا کہ حلقۂ عقیدت میں جتنا اضافہ ہوتا جاتا تھا ان کی فروتنی اتنی ہی بڑھتی جاتی تھی۔ زمین نے اپنے نمود کے پورے امکانات ان کے سامنے رکھ دیے تھے لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی بے نیازی کی بے تعلقی کی حد تک پہنچ گئی۔ وہ وقت کی سیاست پر پوری طرح قابو یافتہ ہوتے کے باوجود ایسی حالت میں کہ دھارے کو توڑ دینے کی طاقت ان کی زبان میں اور تبدیلیوں کی لگام ان کے ہاتھ میں تھی، وہ سیاست کے رُخ اور مزاج سے دل برشتہ ہو گئے تھے۔

آخری دور میں مشغولیتوں کا سارا مصرف اور سرگرمیوں کا پورا زور انھوں نے مسلمانوں کی دینی اصلاح اور معاشرتی سُدھار کی جانب منتقل کر دیا تھا۔ انھیں مسلمانوں کی آشفتہ حالیوں، پریشانیوں، بدبختیوں اور ذلتوں کا جتنا احساس ہوتا تھا۔ ان کی دینی بے تعلقی اور اسلام سے برگشتگی دیکھ کر اتنی ہی ان کی جھنجھلاہٹ بڑھتی اور برہمی میں اضافہ ہوتا تھا وہ قدرتاً ایک مجدد کی رُوح اور انقلاب کی تیز تر لہر لے کر اس دنیا میں آئے تھے اسی لیے جب انھیں اس قوم کی پراگندگی، احساس کمتری، تباہ حالی اور مصائب کے مناظر دیکھنے پڑتے تھے جو فطرت کی طرف سے صرف کامیاب، برتر حاکم اور فاتح ہونے کے لیے منتخب ہوئی تھی تو انھیں بڑی اذیت بڑی تکلیف اور بہت بڑا

صدمہ ہوتا تھا ایک عظیم مذہبی رہنما اور طریقت کے عظیم تر ہادی ہونے کی حیثیت میں
ان کی بجا طور پر یہ رائے تھی کہ مصائب کی جتنی بجلیاں مسلمانوں پر کوندیں، پریشانیوں
اور ماندگیوں کے جتنے طوفان ان کے سروں پر گرجیں مشکلات کی جتنی آندھیوں سے ان کا
سابقہ پڑے اسلام سے ان کا رابطہ اسی اعتبار مضبوط اور دینی احکامات کے سامنے ان کے سر جھکانے کا جذبہ
اسی اعتبار سے شدید ہونا چاہیے لیکن جب انھیں رات دن شکایت کرنے مصائب
کے سامنے دل شکستہ اور نڈھال ہو کر کھڑے ہو جانے اور وقت کے ہنگاموں میں
اپنی حیثیت بھول کر فریاد بلب ہونے والے اسلام اور دین سے حسب معمول غافل
بلکہ برگشتہ نظر آتے تھے تو ان کے جذبات مجروح ہو کر برہمی بلکہ ایک حد تک غیظ
کی شکل اختیار کر لیتے تھے آخری دور میں شیوۂ دین کے تارک لوگوں کے معاملہ میں
ان کے تشدد آمیز اور غضب آلود طرز عمل کا باعث یہی تھا ورنہ جہاں تک ان کے محبت
تعلق، شفقت، اور دل سوزی کا تعلق ہے، گہرے خلوص اور ہمدردی کا سوال ہے اس
کے متعلق تو بس وہی لوگ شہادت دے سکتے ہیں جو گھٹ گھٹ کر رو سکتے ہیں ایک
ہمیشہ رہنے والی کمی کا بجا طور پر احساس کر سکتے ہیں اور ٹٹ جانے کی سی کیفیت پر سوگوار
ہو سکتے ہیں جنھیں ان کی ناراضگی، برہمی، تشدد اور بے تعلقی کے باوجود ان کے سمندر
جیسے لامتناہی خلوص، دل سوزی اور ہمدردی کا تجربہ ہو چکا ہے۔ اگر ایک جائزے میں
ذاتی واردات اور واقعات کا بیان کرنا عیب اور خودستائی اور خودنمائی میں داخل نہ
ہوتا تو میں ایک کھلنڈرے فکر و ذہن کے اعتبار سے شوریدہ اور ایسے آدمی کے ساتھ
جو مذہب اور ان کے آدرش نمونہ کی گرد سے بھی بہت دُور اور محروم تھا، باوجود ناراضگی
اور برہمی کے ان کے تعلق اور خلوص کی ایسی مثالیں پیش کر سکتا تھا جیسی مثالیں اب
کسی کے بھی دیکھنے میں نہ آئیں گی مختصر طور پر یہی کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شخصیت ایسی
عظیم الشان چٹان کی حیثیت رکھتی تھی جو دیکھنے والوں کو کھردری، سخت اور ہیبت ناک
دکھائی دیتی ہے لیکن جس کے اندر میٹھے سرد اور صاف پانی کا ایسا چشمہ ہوتا ہے
جس کا مزہ اور لطف صرف وہی بیان کر سکتا ہے جسے پینے کے لیے اس کے چند قطرے
میسر ہو گئے ہوں۔

میں اس مضمون میں ان کا جائزہ ایک سیاسی رہنما، ایک مذہبی قائد، ایک پیر طریقت

ایک عظیم انسان کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اسی لیے میں انھیں فرشتہ ثابت کرنے کی کوئی کوشش نہیں کروں گا۔ اس لیے نہیں کروں گا کہ وہ فرشتہ نہیں تھے، ان کی برگزیدگی اور عظمت اسی میں ہے کہ ان میں انسانوں کی وہ عظیم سچائیاں اور خوبیاں ایک جا مجتمع ہو گئی تھیں جو اب دور دور تک بھی کسی میں یک جا نظر نہیں آتیں ——— میں نے ابتدا میں کہیں کہا بھی ہے کہ انھوں نے سیاست کو اختیار کیا تھا تو اس لیے نہیں کہ وہ لیڈری کے خواہش مند یا اقتدار کے خواہاں تھے سیاست میں ان کا کردار اتنا یک رنگ، اتنا مضبوط، اتنا ٹھوس، اور استقلال و استقامت سے اتنا بھرپور تھا کہ تغیرات کے زلزلے اور اختلال کی ہوائیں اس پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہو سکتی تھیں اس لیے بلا کسی جھجک کے اس کا خیال کیے بغیر کہ میری اس رائے کو کہاں تک تائید اور اختلاف کی قوت حاصل ہو گی میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وہ ان معنوں میں سیاسی آدمی ہرگز نہیں تھے جن معنوں میں آج کل سیاست داں کا لفظ مستعمل ہے، مذہب اور انسان دوستی نے ملکی محبت اور بزرگوں کی پیروی میں انھوں نے ہندوستان کی آزادی کے لیے لڑائی شروع کی اور آخر تک لڑتے چلے گئے۔ تھکے نہیں، ہارے نہیں، جھکے نہیں، پریشان نہیں ہوئے۔ پھانسیوں کے پھندوں اور تلواروں کے سایے میں انھوں نے انقلاب کے نعرے لگائے اور پورے ہندوستان پر سے غیر ملکی استبداد کا وہ خوف ملیامیٹ کر دیا جو ۱۸۵۷ء کے بعد سے اس پر مسلط تھا انھوں نے قوم پروری کا دامن پکڑا اور پھر اس کا حق اس طرح ادا کیا کہ فرقہ پرستی کے ایک عظیم طوفان میں بھی جب کہ ظلمت کے بیٹوں کی اڑائی ہوئی کیچڑ سے ان کے لباس اور ظواہر کا کوئی حصہ لتھڑنے سے باقی نہیں رہ گیا تھا، انھوں نے اس دامن کو نہیں چھوڑا اپنوں کی گالیاں، غیروں کی قید و بند، اذیت ناک محنت، سی کلاس کی مشقت، انتہائی دل آزار برتاؤ، استقامت کی اس عظیم چٹان کے قدموں میں لغزش پیدا نہیں کر سکا انھوں نے انتہائی حوصلہ فرسا اور صبر آزما ماحول میں آزادی کی تحریک کو بڑھایا اور ہندوستان کی مسلم آبادی کے ماتھے پر سے وہ داغ مٹانے کے لیے اپنے لہو کا چھڑکاؤ کر دیا جو حمایت کی جدوجہد میں اس کے منفی رُخ کے باعث ہمیشہ کے لیے لگنے جا رہا تھا۔ یہ سب کچھ انھوں نے کیا، ایک عظیم لیڈر اور رہنما کی حیثیت سے کیا لیکن ان میں وہ "اہلیت" قطعی نہیں تھی جس کے

بغیر آج کے دور میں لیڈری کو سنبھالا اور چمکایا جاتا ہے وہ مکاری اور ریاکاری کی ان کامیاب "صلاحیتوں" کے حامل نہیں تھے جو شخصیتوں کے بتوں کو تعمیر کرتی اور ساحرانہ حربوں سے انھیں قابل تعظیم تسلیم کرا لینے میں کامیاب ہوتی ہیں، ان کے بجائے کوئی دوسرا ہوتا تو اس کی خدمات کے اعتراف میں نہ صرف یہ کہ ہندوستان کے بڑے شہروں کے چوراہوں پر اس کے اسٹیچو نصب ہو جاتے بلکہ پڑپوتوں تک کے لیے اس کی اولاد کو فکر معاش سے آزادی حاصل ہو جاتی۔ اس کے بجائے ہوا یہ کہ وہ خاموش جدوجہد کے روشن ترین نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھ کر ایک عظیم فتح کا بچشم خود نظارہ کر کے اس دنیا سے اس حیثیت میں کامیاب و کامران رخصت ہوئے لیکن شاید ان کا اثاثہ اس سے کم ہی ہوگا جتنا کہ ایک ادنیٰ دنیادار اور ملازمت پیشہ انسان اپنی باقیات کے لیے چھوڑ جاتا ہے انھوں نے شہیدوں کی سی زندگی بسر کی ہے اور ہر قدم ہر زندگی کی خستہ کامیابیاں اور مجبوریاں، اذیت اور صبر، دل آزاریاں اور تشکر، علائق اور بے نیازی جدوجہد کی سنگینی اور تنہائی کا احساس پھر ان سب کے مشترکہ ہجوم سے پیدا شدہ کشمکش ان کے سامنے آتی رہی ان پر ہجوم کرتی رہی، وہ اس ہجوم کو، اس ہیجان و اضطراب کو برداشت کرتے رہے، یہ ان ہی کا دماغ تھا جو اتنے افکار و آلام کے درمیان متوازن اور درست رہ سکتا تھا ورنہ مضبوط ترین گنبد چٹخ جاتے۔

وہ اگر دنیاداری اور ریاکاری کو گوارا کر لیتے، اپنے کردار میں لچک اور اس کے امکان کا ادنیٰ سا شائبہ بھی پیدا کر لیتے، مضبوطی کے بجائے نرمی، اور ایک رنگی کے بجائے رنگا رنگی ان کا شیوہ ہوتا یا بالفاظ دیگر وہ سچائیوں کے پیرو رہ کر بھی مصلحت اور جھوٹ کو اپنی بارگاہ تک آ جانے کی اجازت دے دیتے تو مجھے نہیں معلوم کہ ہندوستان میں ان سے زیادہ بااثر لیڈر، کار حکمرانی میں بارسوخ اور دخیل انسان، عوام کا مقبول و محبوب رہنما، کوئی دوسرا ہو سکتا تھا لیکن انھوں نے اپنا کردار ایثار رکھا کہ جھکنے اور لچکنے کا تصور، ترغیب میں آتے اور منفعت پر راضی ہو جانے کا خیال ان کے بدترین دشمن بھی ان کے متعلق نہیں کر سکتے تھے۔ دولت جو انسانی حوائج میں سب سے زیادہ دخیل اور انسان کی کمزوریوں میں بدترین کمزوری ہے ان کی نظروں میں شاید سب سے زیادہ حقیر تھی ——— یہ میرے سامنے کی بات ہے کہ ان کے سب سے بڑے حریف

اور عناد کی حد تک ان سے اختلاف رکھنے والے ایک عظیم رہنما کے پاس ایک آدمی ایک لاکھ روپیہ امانتاً رکھنے کے لیے آیا ـــــ یہ آدمی یورپ جارہا تھا اور چاہتا تھا کہ یہ روپیہ ایسی جگہ محفوظ رہے جہاں سے اس کے ورثاء کو حسب طلب فوراً مل جائے۔ انھوں نے اس روپے کو رکھنے سے معذوری ظاہر کی۔ اور بہ لطائف الحیل اُسے ٹالنا چاہا ـــــ اس شخص نے ان کا منشاء سمجھ لیا اور خواہش ظاہر کی کہ وہ کوئی ایسا آدمی انتخاب کردیں جس پر وہ اعتبار کرسکے۔ اس کی خواہش پر انھوں نے بلا ایک لمحہ سوچے کہا:۔

اگر راضی ہو جائیں تو مولانا مدنی کے پاس رکھ دو۔ اس نے وجہ پوچھی تو انھوں نے بے جھجک کہہ دیا:۔

ان کی بہت سی باتوں سے ہمارا اختلاف ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ دولت سے بے نیاز آدمی ان سے زیادہ ہم میں کوئی نہیں ہے۔

اس آدمی نے وہ روپیہ امانتاً مولانا کے پاس رکھا یا نہیں، یا مولانا نے اسے گوارا کیا یا نہیں، یہ خارج از موضوع بات ہے۔

اس واقعے کو پیش کرنے کا مقصد اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ ان سے اختلاف رکھنے والے بھی ان کی دیانت اور دولت کے معاملے میں اُن کی بے رُخی سے نہ صرف واقف تھے بلکہ علانیہ اس کا اعتراف کرنے پر بھی مجبور ہو جاتے تھے۔

(ہفت روزہ بیباک۔ سہارنپور ۱۴ر جنوری تا ۲۱ر فروری ۱۹۵۸ء)

. : .

مردِ مومن

منظور الحسن ندوی قاسمی

تا سحر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا!
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

جس طرح آدمی کا جینا کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں اسی طرح مرنا بھی کوئی تعجب خیز حادثہ نہیں۔ موت یقینی اور برحق ہے دراصل زندگی کا مقصد و منتہا ہی موت ہے جس سے کسی کو مفر نہیں۔ سبھی دیکھتے ہیں کہ موت ہر شہر گاؤں قصبہ جنگل صحرا دریا و سمندر میں زندگی کے ہاتھوں خراج وصول کرتی ہے یہ سو فیصدی حقیقت ہے کہ گلشن ہستی میں مانند نسیم ارزاں موت ہے لیکن موت و حیات کے ڈھنگ رنگا رنگ ہوتے ہیں نرالے اور اچھوتے ہوتے ہیں گوناگوں قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک وہ ہے جو زمانے سے زندگی کی بھیک مانگتے مانگتے اور زندگی کے لیے دامن پسارتے پسارتے ہی دنیائے رنگ و بو سے رخصت ہو جاتا ہے۔ خواہشوں آرزوؤں کی دنیا لیے ہوئے ناکام حسرتوں کا جنازہ لیے ہوئے۔ ایک دوسری قسم ان موتوں کی ہے جو زندہ رہتے ہیں تو زمانہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے۔ وقت کی نبض ان کے ہاتھوں میں رہتی ہے رفتارِ زمانہ ان کے آہنی عزم و استقلال کے آگے سپر ڈال دیتے ہیں وہ زندگی کی بھیک تو کیا مانگتے البتہ خود ہی زندگی کے متحرک تابوت کو موت کی پھیلی ہوئی جھولی کے سپرد کر دیتے ہیں۔

ضلع اناؤ کے ایک قصبہ بانگر مئو میں سادات کے معزز خاندان میں ولادت ہوئی۔ صالح والدین کی گود میں پروان چڑھے۔ گھریلو ماحول خدا ترس اور پاکیزہ تھا۔ اٹھان بھی بڑے البیلے اور نکھرے طرز پر ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اور پھر ایشیا کی سب سے عظیم مادر علمی دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا۔ وقت کی سب سے دور رس نگاہ نے اپنے ہونے والے جانشین کو پہچان لیا۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن نور اللہ مرقدہ نے تیرہ ۱۳ سال کے حسین احمد میں وہ جوہر تاڑ لیے جو ان کے روشن مستقبل کا پتا دیتے تھے یا یوں کہیے کہ وہ جو کہا گیا ہے تا کہ قدر جوہر شاہ داند یا بداند جوہری اس

کی بہترین مثال مل گئی، احمد و محمود کے اتصال نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا طالب علمی کے دور ہی سے بڑے ممتاز رہے۔ جب کہ نوجوانی کی امنگیں کیا کیا پہلے نہیں دکھلاتی اور آرزوئیں کہاں کہاں بسیرا نہیں لیتیں، لیکن وہ جو کہا گیا ہے "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" تو بیسویں صدی کا یہ حسین شروع ہی سے اوصاف حمیدہ کا حامل تھا سات ہی سال میں فراغت پا گئے اور اب شاہ واحد کے بعد جوہری واحد کی باری آگئی شاہ محمود نے جس جوہر کو جلا دے کے رنگ و نور چمک دمک میں اضافہ کر دیا تھا اسے جوہری گنگوہی نے تراش خراش کر اس قابل بنا دیا کہ اپنے دور کے نشانِ راہ بن گئے گویا گنگوہی مجمع نے فولاد کو کندن بنا دیا۔ خداداد صلاحیتیں کیا کم تھیں کہ بزرگوں کی نظرِ کرم اور پیر محمود کی تعلیم کا اتنا گہرا اور چمکیلا رنگ کہ اور کہیں نہیں دنیا کے عالی مرتبت نام دیارِ حبیب میں خانۂ محبوبِ حقیقی یعنی مسجد نبوی میں سالہا سال تک قال اللہ و قال الرسول کی دل فریب صداؤں کو عوام تک پہنچانے کا عظیم فرض انجام دیتے رہے دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ مسند تدریس پر وہ شاہانہ و عالمانہ وقار دنیا نے صدیوں بعد دیکھا ہوگا۔ بے ساختہ علماء سلف کی یادیں تازہ اور زندہ ہو جائیں۔ مخالف اہل مسلک حضرات نے علمی مخالفت کے کیا کیا تیر نہیں چھوڑے کیا کیا نکتہ چینیاں نہیں کیں، لیکن ہندی نژاد عجمی نے عرب کے دل میں جگہ بنانے کے وہ وہ علمی کرشمے دکھلائے کہ عرب و عجم کی تفریق لسانی ہیچ ہو گئی۔

اور ایک مدت کے بعد جب عجم کے حسنِ طبیعت اور عرب کے سوز دروں کی جامع شخصیت کی وطن کو واپسی ہوئی تو یہاں کا بھیانک نقشہ دیکھ کر کلیجہ منھ کو آگیا یا خدا! دنیا کی حکمرانی کے لیے پیدا کی گئی قوم اور کفر و باطل کے نرغے میں مسلم اور غیر مسلم کے پنجۂ استبداد کا شکار اور شرک کے محکوم!!!

سر دھڑ کی بازی لگا کر میدانِ سیاست میں کود پڑے، استاد کی پوری طاقت، رفیقِ کارواں بلکہ رہبر تھی آزادیٔ کامل کی جد و جہد شروع ہو گئی۔ قدم بھی اٹھایا گیا تو کس کے خلاف جس کے متعلق سنا جاتا تھا کہ سورج بھی اسی کی حکومت میں غروب نہیں ہوتا ہے۔ سیاسی پارٹیوں کو سہارا دیا، سوئی ہوئی قوم کو جھنجوڑا، فرائض سے آشنا کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ بوریہ نشین میدان کارزار کا مثالی غازی بن گیا۔ اس کی وسیع نظری صرف ہندوستانی مسلمانوں کی دشواریوں کا حل نہیں تلاش کرتی تھی اس کے دل میں پوری امت کی خستہ حالی کا درد تھا، قوم کی بگاڑ کا خیال تھا، عالم اسلام کی ان مصیبتوں کا جو وقت کی بڑی اور جابر سلطنتوں کی جانب سے مرحمت ہو رہی تھیں عالم گیر تنظیم شروع کی گفتگو کے لیے اسی مقام کا انتخاب ہوا جو آج سے تیرہ سو سال پہلے بھی ساری دنیا کی فلاح و بہبود

کا بیڑا اٹھا چکا تھا اور صدیوں تک اس کا مرکز و گہوارہ رہ چکا تھا۔

حج کے زمانہ میں شیخ الہند کی معیت میں ترکی و مصر کے نمایندوں انور پاشا اور جمال پاشا سے گفتگو ہوئی عملی تدابیر اختیار کرنے پر غور و خوض کیا گیا کام بڑے سُلجھے طریقہ پر ہو رہا تھا۔ منظم اور خفیہ لیکن سرکار بہادر کو اطلاع ہو گئی دانشِ فرنگ کی جعل سازیاں تمام ہی دنیا میں پھیلی ہوئی تھیں۔ نتیجۃً مالٹا کی اسارت سامنے آئی جو فاتح آزادی کا سب سے سنہرا اور تابناک دور ہے۔ رہائی طویل مدت بعد ہوئی۔ وطن مراجعت ہوئی تو شوقِ طلب کچھ اور تیز ہو چکا تھا آگ دکھانے کے بعد سونے کی چمک اور بھی نکھر گئی تھی۔ قوم میں آزادی کی لگن تیز تر ہو گئی بڑے پیمانے پر تحریک چلی مختلف رکاوٹیں پیش آئیں لیکن حق گوئی صداقتِ عملی کسی کام سے باز نہ رکھ سکی۔

مالٹا نے سب سے گہرا داغ جو دیا جس کا کفارہ ناممکن تھا وہ یہ کہ شیخ الہند وہاں سے جو مرض لے کے آئے وہ تو نہ رخصت ہو سکا، البتہ چند مہینوں کے بعد خود رخصت ہو گئے۔

سیاسی دور میں غیروں سے زیادہ اپنوں نے چرکے لگائے گھاؤ پر گھاؤ لگے کیا کیا گستاخیاں اور شرارتیں نہ کی گئیں، رسوائی و تذلیل کے کون سے حربے نہ اختیار کیے گئے مگر ثبات قدمی و عزم راسخ کا ایک پہاڑ بنے رہے۔ کیا مجال جو ذرا بھی لغزش آجائے، رکاوٹوں کی مسلسل یورشوں اور طاغوتی و فرعونی قوت بھی کبھی خوف و ہراس پیدا نہ کر سکی۔

دامے درمے قدمے سخنے ہر طرح اسلام کا یہ شیر باطل کے حملوں کے لیے اسلام کی طرف سے سپر بنا رہا اور دنیا نے دیکھ لیا کہ حق و صداقت کی فتح کیسی اور کیسے ہو گئی۔

معمولی گوشت پوست کا یہ متحرک سایہ دوستوں کی مجلس میں بید کی طرح لچک دار اور باطل کے مقابل میں پہاڑ سے زیادہ اٹل ثابت ہوا۔ مومن کی سچی شان کا نمونہ کہ ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم

رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

مردِ حق کی قربانیوں، ایثار اور جاں نثاریوں کی شہادت چاہیے تو عرب کے ریگ زاروں اور سمندر پار مالٹا کے لالہ زاروں سے پوچھی جائے۔ کراچی خالق دینا ہال کے در و دیوار اور ماحول پر اب تک غازی قوم کی صدائے حق گونجتی ہو گی۔ احمد آباد و نینی تال کی کال کوٹھڑیوں نے اس مجاہد صلت اور فرشتہ صفت مردِ قلندر کو صبر و سکون اور قوم کے غم میں باچشم تر دیکھا ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے ذرہ ذرہ سے آپ کی قربانی و ایثار کی گواہی مل سکتی ہے۔ روحانیت کے فیضان کا لامتناہی سلسلہ

جو مسجد نبوی سے لے کر دارالحدیث دیوبند اور مہمان خانہ شیخ اور ٹانڈہ کی اقامت گاہ، سلہٹ کے متعدد مدارس و مکاتب تک پھیلا ہوا ہے۔ جس سے ہزاروں لاکھوں تشنگانِ ہدایت آسودگی پاتے رہے جو ایک منکر عظمت کے اطمینان قلب کے لیے کافی ہیں وہ دلوں کے حکمراں تھے شاہوں کے بادشاہ تھے، مرجع خلائق تھے، منبع روحانیات تھے، مرکز تعلیمات نبویہ تھے مصدرِ علوم شرعیہ تھے، مجدد سنت اور مجتہدِ امت تھے۔ مختصر یہ کہ مرد کامل تھے جن کی زندگی آئینہ کی طرح شفاف اور بے داغ تھی۔ تواضع و مہماں نوازی میں جواب نہیں تھا۔ حلم و بردباری میں مثال نہ تھی بقول جگر ؎

وہ حلم اور وہ تواضع اور وہ طرز خود فراموشی
خدا بخشے جگر کو لاکھ انسانوں کا انسان تھا

آہ! ان کی بے وقت جدائی نے قوم ملت کو عظیم سانحہ سے دوچار کر دیا ہے۔ میر کی زبانی ؎

مصائب اور تھے پر ان کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

اَب نگاہیں ڈھونڈھیں گی اس مقدس صورت کو جس کے نزدیک تمیز آقا و بندہ فسادِ اذیت تھی جس کے خوانِ نعمت پر اچھی سے اچھی اور معمولی سے معمولی چیز پر بھی سبھوں کا برابر حق تھا جس کے پایہ اقدس نے دولت کو نہیں پر دولت دین کے لیے ٹھوکر ماری جس کی نگاہِ سحر طراز نے دشمنوں کے بھی دِل موہ لیے رات کی تاریکیوں میں درد و وظائف قیام و تہجد میں لگا رہنا محبوب حقیقی کے سامنے عجز و انکسار سے بھیک مانگتا رہا اپنے لیے نہیں قوم کے لیے اپنے وابستگان کے لیے اور دن کے اجیالوں میں دارالحدیث کی دیواروں سے قال اللہ و قال الرسول کی صدائے بازگشت سنواتا رہا دین اور پیروان دین کے لیے کیا کیا مصائب نہیں جھیلے ایسی شخصیتیں پیدا کرنے کی صلاحیت شاید خاک سے چھین لی گئی ہے۔

(روزنامہ الجمعیۃ، دہلی۔ ۸، ۹ جنوری ۱۹۵۸ء)

. . . ✣ . . .

حیاتِ شیخ الاسلام پر ایک طائرانہ نظر

سید نعمان غنی صاحب دریابادی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ظالم بادشاہ کے سامنے سچی بات کہنا سب سے بڑا جہاد ہے اس ارشاد مبارک پر علمائے حق نے ہمیشہ عمل کر کے دکھایا اور اپنی حق گوئی اور راست بازی کے بے شمار واقعات تاریخ کے حوالے کر دیے۔

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے خلق قرآن کی بدعت پر اپنی آواز بلند کی اور بادشاہِ وقت کے سامنے ببانگ دہل کلمۂ حق کہنے سے باز نہ آئے۔ اگرچہ جانتے تھے کہ اس صدائے حق کا نتیجہ کیا ہوگا؟ چناں چہ اس حق گوئی کی پاداش میں آپ کی پشت کو کوڑے مار مار کر لہولہان کر دیا گیا لیکن حق و صداقت کی وہ آواز جو بلند ہوئی اُسے جور و استبداد بھی نہ روک سکا۔

ہندوستان میں بھی ہندوستان کے ایک شیخ الاسلام حضرت الحاج الحافظ مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اسلام کی تعلیم اور علمائے حق کے قدم بقدم اُسی وادی خارزار میں گامزن رہے مالٹا، کراچی اور مراد آباد کی جیلوں میں اسی کلمۂ حق کے بلند کرنے کے جرم میں جلد وطنی و نظر بندی اور قید کی سالہا سال کی مصیبتیں جھیلیں، شفیق والدین، اطاعت شعار اور محبت گزار بیوی، معصوم اور شیر خوار اولاد اور خاندان کی کئی انمول ہستیوں کو اسی صدائے حق پر قربان کر دیا۔ لیکن حق و صداقت کی وہ لگن جو اسلام کی تعلیم، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن، مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیم و تربیت نے آپ کے دل میں لگائی تھی مٹ نہ سکی بلکہ مصائب و آلام اور رنج و محن نے اس لگن کو اور بھی تیز تر کر دیا۔

شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ ۱۹ شوال ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۹ء کو قصبہ بانگر مو ضلع اناؤ میں پیدا ہوئے۔ وطن مالوف موضع الہ داد پور تحصیل ٹانڈہ ضلع فیض آباد تھا۔

آپ نے پہلے پرائمری اسکول میں تعلیم حاصل کی پھر ۱۳۰۹ھ میں جب کہ آپ کی عمر ۱۲ سال کی تھی دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ نے خود تعلیم و تربیت کی، ۱۹ سال کی عمر میں فراغ حاصل کیا ۱۳۱۶ھ میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ

کے دست حق پر بیعت کی ۔ ۱۳۱۶ھ میں جب مولانا کے والد ہجرت کر کے مدینہ منورہ جانے لگے تو آپ بھی ہمراہ گئے ۔ مولاناؒ نے مراحلِ سلوک و طریقت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے طے کیے ۔

مولانا کئی سال تک مسجد نبوی میں درسِ حدیث دیتے رہے ، کسی ہندوستانی کے لیے یہ سب سے بڑا اعزاز ہے کہ وہ سرزمین عرب میں حدیث کا درس دے ۔ وہ شخص خوش نصیب ہے جو مسجد نبوی میں سالہا سال عبادت کرتا رہا ہو روضۂ پاک کی حاضری دیتا رہا ہو ۔

مولاناؒ ۱۳۱۸ھ میں بحکم مولانا گنگوہیؒ پہلی مرتبہ ہندوستان آئے اور یہاں "دستارِ خلافت" سے سرفراز کیے گئے پھر ۱۳۱۹ھ میں واپس گئے ۔

مولاناؒ ۱۳۲۶ھ میں دوبارہ ہندوستان آئے اور مسلسل تین سال رہ کر حضرت شیخ الہندؒ سے ظاہری و باطنی فیوض حاصل کیے اور دارالعلوم دیوبند میں مدرس ہو کر درس بھی دیتے رہے ۔ شیخ الہند کے حلقۂ درس میں دوسری مرتبہ جامع ترمذی اور صحیح بخاری کا درس بھی لیا ۱۳۲۹ھ میں واپس تشریف لے گئے ۔

مولاناؒ ۱۳۳۱ھ میں تیسری مرتبہ ہندوستان آئے اور ۱۳۳۲ھ میں واپس گئے ۔ ۱۳۳۵ھ میں حکومت برطانیہ کے ایما پر شریف حسین والی مکہ نے حضرت شیخ الہند اور ان کے تمام رفقاء کو حکومت برطانیہ کے حوالے کیا تو اس میں شیخ الاسلامؒ بھی تھے ۔

ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کے جرم میں یہ قافلہ ۲۱ فروری ۱۹۱۷ء کو مالٹا میں قید کر دیا گیا ۔

مولاناؒ اپنے آزادی ہند میں شرکت کے متعلق لکھتے ہیں کہ "میں اس وقت تک نہ مشن آزادی ہند میں شریک ہوا تھا نہ حضرت شیخ الہندؒ کی عملی سرگرمیوں سے واقف رکھا تھا مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد حضرت شیخ الہند نے ایک خصوصی مجلس میں مجھ کو اور مولانا خلیل احمد صاحب کو طلب فرما کر اپنے خیالات اور عملی کارروائیوں سے مطلع فرمایا میں اس وقت تک فقط علمی جدوجہد میں مشغول تھا ___ اب حضرت شیخ الہند کے واقعات اور خیالات سن کر میں بھی متاثر ہوا ___ یہ وقت میری سیاسیات کی ابتداء اور بسم اللہ کا وقت ہے"

(نقش حیاتؒ) اور اس ابتدائی دور ہی میں مالٹا کی قید و بند کی سزا حصہ میں ملی ۔ حضرت مولاناؒ کے والد ، اجداد اور دونوں بڑے بھائی کو بھی ترکی حکومت نے اس بنا پر کہ ہندوستانی تھے یعنی انگریزوں کی رعایا رہ چکے تھے مدینہ منورہ سے اڈریانوپل میں نظربند کر دیا ۔ مستورات تنہا اور بیکس رہ گئیں ۔

والد ماجد نے وہیں وفات پائی، اہلیہ محترمہ، صغیر سن لختِ جگر، سوتیلی ماں اور بھتیجی کی وفات کی خبر ملی۔ قید اور یکے بعد دیگرے اتنے رشتہ داروں کی خبر وفات ایک عظیم سانحہ تھا، دل ہلا دینے والا۔ لیکن یہ شیخ الاسلام کا دِل تھا جس نے پائے استقامت کو لغزش سے آلودہ نہ ہونے دیا اور صبر و سکون کے ساتھ برداشت کیا۔ اسی مالٹا کے دورِ اسیری میں قرآن پاک حفظ کیا۔

۲۰ رمضان ۱۳۳۸ھ مطابق ۸ جون ۱۹۲۰ء کو مالٹا سے رہا ہو کر بمبئی پہنچے۔ تقریباً تین برس دو ماہ مالٹا میں اسیر رہے۔ مالٹا سے واپسی پر کانگریس کے ممبر بن گئے۔ کئی سال تک اُتر پردیش کانگریس کے نائب صدر رہے۔

۱۳۴۰ھ (۱۹۲۱ء) میں فوج و پولیس کی ملازمت کے حرام ہونے کا فتویٰ دیا گرفتاری عمل میں آئی۔ اور یہ مقدمہ "مقدمہ کراچی" کے نام سے مشہور ہے جس میں دو سال کی سزا ہوئی۔ اسارتِ کراچی میں مولانا محمد علی مرحوم نے حضرت سے قرآن پاک کا ترجمہ پڑھا۔
۱۳۴۲ھ (۱۹۲۳ء) میں کوکناڈا جمعیۃ علمائے ہند کے پانچویں اجلاس کی صدارت فرمائی۔ چھ سال تک جامعۂ اسلامیہ سلہٹ میں شیخ الحدیث رہے۔ ۱۳۴۶ھ میں دارالعلوم دیوبند میں دارالعلوم کی صدر مدرسی قبول فرمائی۔

۱۹۴۰ء میں دوسری مرتبہ بارھویں اجلاس جمعیۃ علمائے ہند جونپور کی صدارت کی۔ آپ کا خطبۂ صدارت ضبط کر لیا گیا۔

۱۹۳۹ء میں جنگ عظیم ثانی شروع ہو چکی تھی آپ نے سب سے پہلے جبریہ بھرتی اور ہندوستان کو جبر بطور پر جنگ میں شرکت کے خلاف پوری قوت سے مخالفت کی اور ۱۹۴۲ء کے اجلاس جمعیۃ علمائے ہند منعقدہ لاہور میں کرسیٔ صدارت سے اعلان کیا:

> "اگر تاریخ کے اس نازک ترین دور میں برطانوی شہنشاہیت کا مقام ناقابلِ تبدیل ہے، اگر مصیبت و ابتلا کی اس کٹھن گھڑی میں بھی برطانوی مدبرین کی اس تاریک ذہنیت میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی تو برطانیہ اور تمام دنیا کو یقین کر لینا چاہیے کہ ہم اس کی اور اپنی زندگی کی آخری گھڑی تک اپنی آزادی اور خود مختاری کے نصب العین کو فراموش نہیں کر سکتے۔ ہم اس جابرانہ تصور کے سامنے سر جھکانے سے انکار کرتے ہیں جو ہمارے نصب العین سے متصادم ہے اور زندگی کی ہر اس فرصت میں جس میں ہمارے لیے اپنی

منزل کی طرف سفر کرنا ممکن ہے ہم اپنے نصب العین کی طرف قدم بڑھاتے رہیں گے۔"

چنانچہ اس اعلان کے بعد ۲ر جون ۱۹۴۲ء کو مولانا کی گرفتاری عمل میں آئی اور یہ سلسلہ نظر بندی ۱۹۴۵ء تک رہی ۱۹۴۵ء میں چوتھی بار چودھویں اجلاس جمعیۃ علماے ہند سہارنپور کی صدارت کی۔

۱۹۴۶ء میں ہندوستان کی گتھی سلجھانے "وزارتی مشن" ہندوستان آیا تو مولانا نے بھی جمعیۃ علماے ہند کے نمائندہ کی حیثیت سے گفتگو کی اور قوم پرور نظریے کا اظہار فرمایا۔

شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق چند رائیں ملاحظہ ہوں:

(۱) مولانا عبدالماجد صاحب دریاآبادی مدیر صدق لکھنؤ فرماتے ہیں:

"مولانا کے ذاتی معمولات سے جو ذرا بھی واقفیت رکھتا ہے کہ ماہ رمضان ان کے ترک و تبتل کا زمانہ ہوتا ہے، تراویح سنانے کی مشق دو دو ماہ قبل سے شروع فرما دیتے ہیں بعد مغرب دو دو پارے ہر روز اپنے پیچھے کسی جید حافظ کو کھڑا کر کے رجب سے سنانے لگتے ہیں یہاں تک کہ جب ماہ مبارک آجاتا ہے تو ہجوم اشتغال سے بچنے کے لیے سلہٹ کے گوشۂ عافیت میں تشریف لے جاتے ہیں اور ہجوم خلق سے الگ یہ سارا مہینہ ریاضتوں اور عبادتوں کی نذر کر دیتے ہیں۔" (صدق لکھنؤ ۱۲ر نومبر ۱۹۳۷ء)

(۲) مولانا عبدالماجد فرماتے ہیں:

"مولانا کا نصب العین بحمداللہ آج بھی وہی ہے جو ہر غیور مسلم کا ہونا چاہیے یعنی خدمتِ دین اور تحفظ قوتِ مسلمین۔" (ایضاً بحوالہ نقیب، دسمبر ۱۹۳۷ء)

(۳) مولانا عبدالماجد دریاآبادی مدیر سچ "ایک عالم دین کا نعرۂ حق" کے عنوان سے لکھتے:

"میرے محترم بزرگو! مکمل آزادی اسلام اور مسلمانوں کا ہندوستان میں فریضہ ہے یہ جملہ مسلمانوں کا مطمح نظر ہونا چاہیے، تو اعدِ شرعیہ کی بنا پر اگر مسلمان اس سے غافل ہوئے تو عنداللہ ماخوذ ہو جانے کے مستحق ہوں گے۔ مسلمانوں پر حسب طاقت ضروری ہے کہ اس راہ میں گامزن رہیں اور کبھی بھی اس فریضے کو نہ بھولیں۔ ہم جب تک جان میں جان ہے اپنی طاقت کے موافق آزادی

کے لیے سعی کریں گے۔ خواہ کوئی ہمارا ساتھ دے یا نہ دے۔ اللہ ہمارا ولی ہے۔"

یہ اقتباس ہے جانشین شیخ الہند حضرت مولانا حسین احمد صاحب محدث صدر جمعیۃ علمائے صوبہ متحدہ کے خطبۂ صدارت کا جو "سچ" میں تمام وکمال شائع ہو رہا ہے۔ آج ہمارے جن آزاد خیال عزیزوں اور دوستوں کو اپنی نیشنلزم (قوم پروری) پر ناز ہے اور جو قومیت کو مذہب کی قیود سے بلند تر سمجھ رہے ہیں کیا وہ اپنی تحریر و تقریر کے سارے انبار میں اس سے زیادہ پُرزور الفاظ میں آزادی کامل کی حمایت دکھا سکتے ہیں؟

مولانا فرماتے ہیں:

"نہرو رپورٹ والی "حکومت بہ طرز نو آبادیات" کا نہیں۔ آزادی کامل کا مطمح نظر، کسی وقتی مصلحت کی بنا پر نہیں، کسی ہنگامی جوش و خروش کی بنا پر نہیں بلکہ دینی و مذہبی حیثیت سے ایک مستقل فریضہ ہے اور مسلمان اگر اس سے کسی حال میں بھی غافل رہے تو عنداللہ مواخذہ کے مستحق ہوں گے! دین داری کو جذبۂ قومیت کے منافی سمجھنے پر اصرار اب بھی قائم رہے گا!"

(سچ بہ حوالۂ امارت، پھلواری ۵ رجمادی الاولیٰ ۱۳۴۸ھ)

(۴) اخبار اجمل بمبئی اپنی ایک اشاعت میں لکھتا ہے:

"دھل گمر کی اس ہندوانہ فضا میں جس کا وہ شاکی ہے خاص سبجکٹس کمیٹی میں شیخ الہند حضرت مولانا حسین احمد صاحب نے مغرب کے وقت اذان دی اور مسلمانوں کی ایک خاص بڑی جماعت نے جو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے متعدد مسلمان ممبروں اور بہت سے مسلم مندوبین پر مشتمل تھی، ان کی اقتدا میں نماز باجماعت ادا کرنے کی سعادت حاصل کی۔

(صدق لکھنو بہ حوالہ نقیب پھلواری ۲۲ مارچ ۱۹۳۹ء)

(۵) حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا:

"مولانا کی سیاسی رائے خواہ کتنی ہی غلط ہو، ان کا علم و فضل بہرحال مسلّم ہے اور اپنے نصب العین کے لیے ان کی عزیمت و ہمت اور ان تھک جدوجہد ہم جیسے کاہلوں کے لیے قابل عبرت ہے۔" (زمیندار لاہور ۱۲ فروری ۱۹۴۶ء)

(۶) مولانا نصر اللہ خاں عزیز مدیر کوثر لاہور فرماتے ہیں:

"مولانا حسین احمد صاحب مدنی اپنے علم و فضل، صلاح و تقویٰ، خدا پرستی و خدا شناسی عزم و ہمت، دلیری و بے باکی، سادگی و بے تکلفی، مجاہدہ نفس و جذبہ جہاد اور استقامت و استقلال اور ایمان و عمل کے لحاظ سے علمائے ہند ہی میں نہیں علمائے اسلام میں یکتائے روزگار ہیں۔ دوسرے لوگ ان سے بعض اوصاف میں بڑھ کر ہوں گے، اگر مجموعی حیثیت میں ان کی مثال نہیں ملتی ان کی ساری زندگی پاکیزہ زندگی ہے اور اسارت مالٹا، قیام مدینہ، حرم نبوی میں درس اور قید فرنگ کی صورت میں جو انعامات الٰہیہ ان پر ہوئے ہیں ان میں کوئی دوسرا شخص ان کی ہمسری نہیں کر سکتا، وہ ایک زندہ، عملی متحرک اور کوہ وقار عالم ہیں جو سنت کی جزئیات تک کے عامل اور اپنے عقائد و عزائم کے لیے کسی سے کوئی مصالحت نہیں کرتے انھوں نے یہ زندگی اپنے اکابر سے ورثے میں پائی ہے جن کے سلسلے کی آخری کڑی حضرت شاہ ولی اللہ ہیں اور جس کی بعض کڑیاں حضرت سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید ہیں اور وہی علم و عمل ان کے پیکر حیات میں روح بن کر جاری و ساری ہے۔"
(اخبار کوثر لاہور، ۶ ستمبر ۱۹۴۶ء)

دنیا فانی ہے۔ ہر چیز فنا ہونے والی اور انسان بھی اپنے مقررہ وقت پر دارالبقا کی طرف انتقال کر جاتا ہے اس سے کسی کو مفر نہیں۔ شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی موت ایک عظیم حادثہ ہے۔ آپ جنگ آزادی کے کمانڈر اور کاروان سلوک و طریقت کے امیر تھے۔ آپ کی زندگی ہمارے لیے شمع راہ ہے کاش ہم آپؒ کی راہ پر چل سکیں۔

شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار لکھنؤ آل مسلم پارٹیز کانفرنس میں فرمایا تھا:
"ہمارا تو ایک مطالبہ ہے جو ہم کانگریس کو دے چکے ہیں وہ یہ کہ ملک کو اختیارات ملنے پر مسلمانوں کو اپنے مذہبی معاملات طے کرنے کے لیے قاضی مقرر کرنے کا حق عطا کیا جائے اور ہم نے کہہ دیا ہے کہ جب تک کہ ملک کو آزادی حاصل نہ ہو ہم تو خاموشی کے ساتھ آزادی کی جنگ میں شریک رہیں گے البتہ آزادی ملنے پر ہمیں یہ حق نہ ملا تو پھر اس وقت اگر ہم میں قوت ہوگی تو ہم اسے منوا لیں گے۔"
(روشن مستقبل ص ۵۴۴)

(روزنامہ الجمعیۃ۔ دہلی، ۱۰ فروری ۱۹۵۸ء)

حضرت شیخ الاسلام کی یاد میں

ڈاکٹر ستیہ دادی

راج نیتی اور سماج سیوا کے دھندوں میں اُلجھنے کے بعد جی چاہتے ہوئے بھی لکھنے کے کام کے لیے وقت نکالنا میرے لیے بہت مشکل ہوگیا ہے۔ وہ بھی دن تھے کہ کچھ نہ کچھ لکھے بغیر کھانا پینا بھی اچھا نہ لگتا تھا، مگر کئی ایسی دُرگھٹنائیں بھی ہوجاتی ہیں کہ آدمی ان کے اثر کو چھپانے کی کوشش بھی کرے، تب بھی دل کی بات منھ پر آئے بغیر نہیں رہتی، ورنہ دم سا گھٹا جاتا ہے اور بات کہہ دینے سے جی ہلکا ہوجاتا ہے جانشین شیخ الہندؒ کا سورگباشی بھی اسی پرکار کی دُرگھٹناؤں میں سے ایک ہے۔ جب میں نے اخباروں میں یہ خبر پڑھی تو منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی مُسلماں روتے ہیں کہ اسلام کا ایک جید عالم دنیا سے اٹھ گیا، جس نے ہند بھومی کے ایک گم نام جیسے ٹکڑے (دیوبند) کو دنیا سے اسلام کا مذہبی کیندر بنا دیا۔ میں کہتا ہوں مولانا مدنی نے عرب میں بیٹھ کر عجم کا سر اونچا کر دکھایا، وہ عرب جو سارے سنسار کو گونگا (عجم) کہتے تھے۔ ایک عجمی کے سامنے برسوں شِشیہ بھاؤ سے (زانوئے تلمذ تہ کر کے) بیٹھے اور اپنی قسمت کو سراہتے رہے۔

انگریزی راج سے اُن کی لڑائی میں کوئی درمیانہ راستہ نہ تھا وہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر ہند آزاد ہوجائے تو سارے عرب ملکوں سے انگریزی شتا (اقتدار) ختم ہوجائے گا اس لیے بھارت کی آزادی میں مسلمانوں کی ڈبہری ذمہ داری ہے۔ خلافت اندولن میں جب پیر جماعت علی شاہ جیسے کچھ بزرگ انگریز کی وفاداری کے فتوے دیا کرتے تھے۔ کراچی میں نجگانہ مقاطعے کا پرستاؤ دے کر مولانا مدنی کی لیڈرشپ میں مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کی گئی اور ایسی آگ بھڑکی کہ اگر چوراچوری کا واقعہ پیش نہ آتا اور گاندھی جی اندولن بند نہ کر دیتے تو ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء (انتقال اختیارات کا دن) کی تاریخ ۲۵ راگست ۱۹۲۵ء کو احمد آباد میں لکھی جاتی اور صحیح بات یہ تھی اس وقت آزادی کی لڑائی میں افغانی اور سرحدی ہوا کے ذہنی خطرے کے زیر اثر ہندو کا قدم بہت سست تھا اور

ترنگا جھنڈا مسلمان کے ہاتھ میں تھا اور اس کا سہرا مولانا مدنی کی جماعت کے سر تھا جو کسی زمانے میں وہابی تحریک کے نام سے انگریزی طاقت کے ساتھ دو دو ہاتھ کر چکی تھی۔

غرض وطنیت کا نشہ مولانا مدنی نے ہندی مسلمانوں کے دلوں اور دماغوں میں بھر دیا کہ اس کا اتار کرنے کے لیے انگریز پہلے سر آغا خاں کو پھر مسٹر جناح کو لندن سے بیرسٹری چھڑوا کر یہاں لایا ڈاکٹر سر اقبال نے مولانا حسین احمد کا نام لے کر جب قومیت اور وطنیت کی بحث چھیڑی اور مولانا مدنی نے ان کا منہ بند کیا۔ مجھے اس زمانے کا مولانا کا ایک سلسلہ مضامین اور کچھ تقریریں آج تک یاد ہیں۔

آزادی کی لڑائی کے دنوں میں جن لوگوں نے مولانا مدنی کی تقریریں سننے کا سوبھاگیہ حاصل کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ تقریر کیا ہوتی تھی۔ ہندوستان میں انگریزی راج کی لوٹ کھسوٹ اور غارت گری کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہوتی تھی۔ مجھے ایک واقعہ یاد ہے اسلامیہ ہائی اسکول جب گھر امی منڈی کے پیچھے تھا۔ اس میدان میں کچھ وکیلوں اور رئیسوں نے ایک جلسے کا اعلان کیا اور مراد آباد کے شیخ محمد یعقوب کو تقریر کے لیے بلایا گیا، راؤ عبدالرحمٰن صدر تھے۔ مشکل سے پچاس سو آدمی اور سو دو سو اسکول کے بچے سننے والوں میں تھے ابھی ٹھیک طور کارروائی شروع بھی نہ ہوئی تھی کہ ہزاروں آدمیوں کا ایک ہجوم دوڑا ہوا آیا اور میدان میں تل رکھنے کو جگہ نہ رہی۔ ان میں بڑی تعداد دارالعلوم دیوبند مظاہر علوم سہارنپور و مخزن العلوم سہارنپور کے طلبہ کی تھی۔ معلوم ہوا کہ مولانا مدنی تشریف لا رہے ہیں ان کی تقریر سننے کے شوق میں یہ لوگ جگہ نہ ملنے کے خوف سے پہلے ہی آگئے۔ اتنے میں ایک اور زبردست ہجوم کے ساتھ مولانا مدنی جلسہ گاہ میں پہنچ گئے۔ مزے کی بات یہ ہوئی کہ نہ جانے کس وقت اور کس طرح پہلی پارٹی پلیٹ فارم چھوڑ کر کہاں بھاگ گئی، مولانا منظور النبی نے اس جلسہ کی صدارت کی تھی۔

تاریخی معلومات سے بھری ہوئی مولانا کی تقریروں کی بابت میں اوپر لکھ رہا تھا اس زمانے میں میں مولانا محمد علی رئیس الاحرار کے اخبار ہمدرد کے لیے رپورٹر کے طور پر کام کر رہا تھا۔ میری ایک نوٹ بک میں مولانا مدنی کی تین تقریروں کے نوٹ درج تھے۔ ایک بار وہ نوٹ بک ایک علم دوست واقف کار کے ہاتھ پڑ گئی، وہ میرے وسیع تاریخی مطالعے کی داد دینے لگے کہ اتنی چھوٹی عمر میں اس قدر کتابیں دیکھ ڈالی ہیں۔ جب میں نے اصل بات بتائی تو مولانا کی حیران کرنے والی یادداشت پر دنگ رہ گئے۔

مجھے مولانا کی تقریر کا ایک انداز اور پسند رہا ہے وہ یہ کہ انگریزی راج کے سخت ترین دشمن ہونے کے باوجود پوری تقریر کے دوران انگریز کے لیے کبھی میں نے کوئی سخت لفظ نہیں سنا۔ وہ ہمیشہ ان کو مہربان کے لفظ سے خطاب کرتے جس میں تقریر کی سنجیدگی کے علاوہ طنز کی ہلکی سی چٹکی کا مزا بھی شامل رہتا۔ ہم چند نوجوانوں کی ایک ٹولی تھی اور ہم سب بہت ہی جونیئر تھے دس پانچ مرتبہ جب مولانا کی مجلس میں شرکت کا موقع ملا تو اپنی کم عمری اور آداب مجلس کے خیال سے ہمیشہ سب سے پیچھے بیٹھے۔ لیکن ہم نے ہمیشہ نوٹ کیا کہ جب کوئی بات خاص توجہ کی فرماتے تو ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتے، جیسے بات کو آنکھوں کے ذریعے ہمارے دلوں میں اتار دینا چاہتے ہیں چوں کہ ہم پیچھے ہوتے تو اس بات کے لیے مولانا کو کئی بار ذرا اوپر کو ابھرنا پڑتا تاکہ ہم پوری طرح نظر کے سامنے آجائیں اور ہم بات سن کر جب تک سر نہ ہلا دیتے گویا ہم کہہ نہ دیتے کہ ہم نے آپ کی بات سمجھ لی ہے آپ نظر نہ ہٹاتے۔

اور شاید اس مجلس میں شامل ہر شخص پر یہ اثر پڑتا کہ مولانا اسی پر خاص طور سے توجہ دے رہے ہیں جیسا کہ ہم سمجھتے تھے۔

مولانا کی مجلس اچھا خاصا ہندو مسلم قومیت کا ایک نمونہ تھا۔ یہ کم ہی ہوا ہے کہ آپ کے غیر مسلم معتقدین سے مجلس خالی ہو۔ اس قدر گمبھیرتا کے باوجود یہ کبھی نہیں ہوا کہ مجلس پر محض ایک خاموشی میں خوف نما ادب کا ماحول طاری ہو اسی میں لطائف بھی چلتے بعض مرتبہ تو ہمارے قہقہے فرطِ ادب کی حد بھی پار کر جاتے ایک مرتبہ چائے کے موقع پر ایک پرائیویٹ صحبت میں مولانا نے جب چائے کا کش لیا تو چائے کو ٹھنڈی پاکر اور یہ کہہ کر کہ ٹھنڈی چائے پینا حرام ہے۔ ملاّ قسم کے حاضرین کو دم بہ خود سا کر دیا۔

شیخ الاسلام کی زبان سے اس قدر واضح الفاظ میں ٹھنڈی چائے کی حرمت کا فتویٰ! مگر ابھی لوگ کن انکھوں سے ایک دوسرے کی جانب دیکھ رہے تھے کہ دوسرے ہی لمحہ کہہ کر سنجیدہ فضا کو ایک دم قہقہوں میں بدل دیا کہ "چائے نوشی کے مذہب میں"۔

ایک دن خفیہ پولیس پیچھا کر رہی تھی اور ہمیں ایک مشن پر پہنچنا تھا۔ کھانا ملنے کی سب سے زیادہ محفوظ جگہ مولانا کا دسترخوان ہی ہو سکتا تھا۔ ہم ایک حجرے میں جلدی جلدی کھانا کھا رہے تھے، فرمایا: یہاں کوئی نہیں پکڑتا۔ اطمینان کے ساتھ چبا چبا کر کھایئے۔

دیش کو بغیر خون خرابہ آزاد دیکھنے کی گہری خواہش تھی، مگر ۱۹۴۷ء کے خونیں واقعات نے اس

خواہش کو زخمی کر دیا۔ آزادی تو مل گئی مگر ایک خونچکاں لاش کی شکل میں، اس نے مولانا کی کمر ہی توڑ دی تھی۔

عہدہ گردی کی اس دور جب کہ ہر خود غرض نے ہوس پرستی کو شعار بنا لیا ہے اور آزادی کی لڑائی میں آگے آگے دکھائی دینے والوں کو اس بھیڑ نے بہت پیچھے دھکیل دیا ہے۔ الیکشن اور پارٹی ہتھکنڈوں کے جھمیلوں میں مولانا نے دخل در معقولات سے کتنا پرہیز کیا سب کو معلوم ہے مگر مجھے کئی ایسے معاملات کا ذاتی علم ہے جس میں مولانا نے اپنے قلم سے کانگریس ہائی کمان کے ذمہ داروں کو توجہ دلائی اور حق بحق دار رسید پر عمل ہو سکا۔!!

(ہفت روزہ بیباک، سہارنپور، رجنوری ۱۹۵۸ء)

. . ⁞ . .

مقدس ہستی

مولانا عبدالمجید صاحب رحمانی

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

پیکر علم وعمل، جامع شریعت وطریقت مجاہد اعظم حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہٗ صدر جمعیۃ علماء ہند و صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کی وفات حسرت آیات سے ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے یہ نہ صرف دارالعلوم دیوبند و ہند و پاک بلکہ دنیائے اسلام کے لیے حادثہ عظیم ہے حضرت شیخ کی ذات اقدس سلف صالحین کا سچا نمونہ تھی۔ ہماری زندگی کے شعبہ کے لیے حضرت کی ذات بابرکات مشعلِ راہ تھی۔ آج سارا ملک بلکہ پورا عالم اسلام وانسانیت یتیم ہوگیا۔ آج ہم سے فن حدیث کا امام، حضرت شیخ العرب و العجم حاجی امداداللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کی نشانی اور قطب اقطاب شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا جانشین اور جود وسخا و فضل وکرم کا بحر ناپیدا کنار، رشد وہدایت کا چراغ، سیاست وتدبر کا قائد اور ماہر درس حدیث روپوش ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ایسی شخصیتیں دنیا میں گنی چنی ہوتی ہیں اور جب دنیا سے رخصت ہو جاتی ہیں تو سالہا سال تک خلا پُر نہیں ہوتا حضرت شیخ الاسلام بلحاظِ فضل وکمال زہد واتقا، جہادِ حریت و عزم واستقلال اپنی مثال تھے۔ حضرتؒ کو وطن سے سچی محبت تھی وطن کو آزاد کرانے کی ایک لگن تھی جس کے لیے حضرت نے جنگ آزادی میں نمایاں حصہ لیا ملک کی آزادی کے لیے جو قربانیاں پیش کی ہیں اور جو جو صعوبتیں اٹھائی ہیں، وہ آئندہ نسلوں کے لیے مشعل راہ ہیں۔ حضرت سیدنا کی ہر ادا گفتار و کردار حرکات و سکنات خورونوش، نشست وبرخاست، عزم واستقلال

مدرس مدرسہ احمدیہ، ابابکر پور۔ ضلع مظفر پور (بہار)

غرض جملہ اوصاف و اطوار سنت کے مطابق تھے۔

حضرت کی زندگی سرتاپا شریعت کے سانچے میں ڈھلی تھی۔ جن کو جس قدر حضرت کو نزدیک سے دیکھنے کا موقع میسر ہوتا، اتنا ہی زیادہ متاثر ہوتا اور وہ یہی پکار اٹھتا کہ یہ مقدس، اتقی سلف صالحین اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زندہ نمونہ ہے، اگر قارئین کرام کو حضرت کی صحبت کا شرف حاصل ہوا ہوگا تو اندازہ ہوگا کہ پاس بیٹھنے سے قلب پر ایک خاص اثر ہوا کرتا تھا۔

میں بھی اپنے کو خوش نصیبوں میں سے تصور کرتا ہوں کہ چند موقعوں سے حضرت شیخ الاسلام کے دورکی بہار دربھنگہ، مظفرپور ضلع میں حاضری دے کر اپنے لیے توشۂ آخرت کا کچھ سامان مہیا کرلیا اور حضرت علیہ الرحمۃ کا یہ فضل وکرم اور محبت تھی کہ راقم الحروف کے غریب خانہ موضع جتوارپور علاقہ سمستی پور (دربھنگہ) کو اپنی تشریف آوری سے زینت بخشی، زہے نصیب۔

آج حضرت شیخ الاسلام ہمارے درمیان نہیں ہیں مگر آپ کی زندگی کے نقوش دنیا کی نگاہوں کے سامنے ہیں جو حضرت موصوف کو زندہ جاوید بنانے کے لیے کافی ہیں ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

دعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ حضرت کی قبر کو نور سے بھر دے اور مسلمانوں کو ویسا ہی جوشِ عمل واخلاق وایثار اور جذبۂ جہاد عطا کرے۔ (روزنامہ الجمعیۃ۔ دہلی۔ ۲۰ فروری ۱۹۵۸ء)

. . . .:. . .

رہنمائے انسانیت

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ

مولانا احتشام الحسن

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی بھی ان مقدس ہستیوں میں سے تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیح وارث اور حقیقی نائب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف حمیدہ کا پرتو اور اس "دور بہیمیت" میں انسانیت کا مکمل شاہکار تھے۔ اُن میں وہ تمام اوصاف نمایاں تھے جو انسانی گروہ کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے درکار ہیں اور ایک حقیقی مسلمان کی خصوصیات شمار کیے جاتے ہیں۔ ان میں سے چند نمایاں اوصاف کو اختصار کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔

ذوق عبادت:

انسان کی انسانیت کا سارا دار و مدار عبادت اور بندگی پر ہے جو شخص جذبۂ عبادت سے خالی ہے وہ انسانیت سے عاری ہے اور جو شخص جذبۂ عبادت سے جس قدر بھرپور ہے اسی قدر انسانیت سے معمور اور کمالاتِ انسانی سے اتنا ہی آراستہ ہے اور یہی عبادت و بندگی انسان کی خلقیت کا اصل مقصود ہے۔ اصل عبادت اور بندگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امتیازی شان تھی اسی لیے "عبدہٗ و رسولہٗ" کے ممتاز خطاب سے سرفراز کیا گیا جیسا کہ اللہ رب العزت اپنی شان ربوبیت اور معبودیت میں یکتا اور بے مثل ہے اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی شانِ عبدیت اور بندگی میں کامل اور بے مثال تھے اسی کمال عبدیت نے کمالِ رسالت اور رسولوں کی سیادت کے اعلیٰ مقام پر پہنچایا۔ پھر جو شخص بارگاہ نبوی سے جس قدر وابستہ ہوا اسی قدر ذوقِ عبادت سے آراستہ ہوا۔

حضرت مدنی رحمتہ اللہ علیہ کے ذوقِ عبادت کا وہ لوگ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں جنھوں نے حضرت کی نمازوں کو دیکھا ہے، ان کی نماز حقیقی نماز ہوتی تھی جس کو حدیث مبارک میں معراج المومنین فرمایا گیا ہے۔ جب آپ نماز میں مشغول ہوتے تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ بندہ سارے عالم سے دست بردار ہو کر اپنے معبود کے ساتھ سرگوشی میں مشغول اور بارگاہ خداوندی میں باریاب ہے جو آیت بھی نماز میں تلاوت ہوتی تھی۔ سننے والوں کو ایسا محسوس ہوتا تھا گویا وحی نازل ہو رہی ہے اور وہ کیفیت اور رقت طاری ہوتی تھی جس کا بیان دشوار ہے، بارہا اس بات کو دیکھا گیا کہ حضرت مدنی سفر میں ہیں سفر کا تعب برداشت کر کے آتے ہیں اور پھر سفر کرنا ہے مگر جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو ایسی شان کے ساتھ پڑھتے کہ گویا نہ پہلا تعب تھا اور نہ آیندہ کوئی کام کرنا ہے۔

ایک مرتبہ سونی پت سے واپسی میں اسٹیشن پر پہنچے تو فجر کی نماز کا وقت تھا اور گاڑی آنے والی تھی عرض کیا گیا کہ جلدی سے نماز پڑھ لیں فرمایا نہیں ریل میں پڑھیں گے۔ ریل آگئی تھرڈ کلاس کا ٹکٹ تھا اور مسافروں کا ہجوم بمشکل ایک ڈبہ میں سوار ہوئے اور نماز کے لیے گنجایش نکالی گئی پھر حضرت مدنی رحمتہ اللہ علیہ نے نماز جو پڑھائی تو اسی انداز اور اطمینان کے ساتھ کہ گویا محلّہ کی مسجد میں نماز پڑھا رہے ہیں اور ذرا محسوس نہ ہوا کہ ریل میں ہیں اور جگہ تنگ ہے۔

گزشتہ سال قصبہ جلال آباد میں جلسے کی شرکت فرما کر بذریعہ کار کاندھلہ تشریف لائے اور بعد مغرب پہنچے تھوڑی دیر میں عشاء کا وقت ہو گیا، حضرت مدنی نماز کے لیے اُٹھے اور ضعف و نقاہت کی وجہ سے بمشکل اُٹھا گیا اس وقت بعض خدام نے عرض کیا ضعف بہت ہے۔ بجائے مسجد میں جانے کے یہیں جماعت کر لی جائے۔ ارشاد فرمایا نہیں۔ جلال آباد میں تو اس مجبوری سے قیام گاہ پر نماز پڑھی تھی کہ ہجوم کی وجہ سے مسجد میں جگہ نہ تھی یہاں کیا مجبوری ہے؟ مسجد تشریف لائے اور اس اطمینان کے ساتھ فرض اور سنتیں ادا فرمائیں کہ انتظار کرنے والے تھک گئے۔ حضرت مدنی رحمتہ اللہ علیہ کو کثرت اسفار کے باوجود مسجد کی جماعت کی شرکت کا شدت کے ساتھ اہتمام تھا۔ صرف مجبوری کے عالم میں مسجد کی جماعت ترک ہوتی تھی۔

نوح کے عظیم الشان جلسے میں ستر اسی ہزار آدمیوں کا ہجوم تھا اور جامع مسجد میں گنجایش کم تھی اس لیے یہ انتظام کیا گیا کہ حضرت مدنی رحمتہ اللہ علیہ کی امامت میں جلسہ گاہ میں بھی جمعہ کی نماز ادا کی جائے حضرت مدنی نے اس کو منظور فرمایا مگر انتہائی ناگواری اور ناراضگی کے ساتھ اس لیے کہ جب حضرت مدنی رح کو اس بات کا علم ہوا تو قصبے کی مساجد میں نماز جمعہ ہو چکی تھی۔ حضرت مدنی رحمتہ اللہ علیہ ہر وقت ذکر اللہ میں مشغول رہتے تھے۔ پاس انفاس جاری رہتا تھا۔

اس کا اندازہ اس وقت ہوتا تھا جب حضرت مدنی بار بار انتہائی سوز و گداز اور بے قراری کے ساتھ پڑھتے تھے۔ یا حی یا قیوم برحمتک استغیث۔ بظاہر اخبار پڑھتے تھے اور لوگوں سے باتیں کرتے تھے لیکن بباطن اپنے مولائے کریم کی یاد میں مستغرق تھے۔

عزیزی مولوی افتخار الحسن سلمہٗ بیان کرتے ہیں کہ وصال سے ایک روز قبل بعد عشاء ردّ سحر کا عمل ہو رہا تھا حضرت مدنی رحمتہ اللہ علیہ نے انتہائی بے قراری کے ساتھ پڑھا۔ یا حیّ یا قیوم برحمتک استغیث جب چند بار ایسا ہی ہوا تو حاضرین میں سے کسی نے عرض کیا حضرت کیا کوئی تکلیف یا درد ہے؟ ارشاد فرمایا "یہی تکلیف کیا کچھ کم ہے کہ آپ حضرات کام میں مشغول ہیں اور میں بیکار پڑا ہوں" عرض کیا گیا۔ حضرت آپ نے تو بہت کام کیا ہے اتنا کام تو ایک جماعت بھی نہیں کر سکتی "ارشاد فرمایا" میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا"

حضرت مدنی رحمتہ اللہ علیہ اپنے ایک مکتوب گرامی میں اپنے ایک مسترشد جناب پیر غلام حسینی صاحب (دیوسف پور محمد آباد ضلع غازی پور) کو تحریر فرماتے ہیں "پاس انفاس کے شروع کرنے سے خوشی ہوئی" "میرے محترم پاس انفاس سے اصل غرض یہ ہے کہ انسان کا کوئی سانس اللہ کے ذکر سے خالی نہ رہے، نہ اندر جانے والا سانس اور نہ باہر نکلنے والا سانس۔ انسان دن رات میں تقریباً پچیس ہزار سانس لیتا ہے سب کا سب ذکر سے معمور ہے ابتدا میں ایک گھنٹہ صرف اس لیے مقرر کیا گیا ہے کہ عادت ہونے لگے یہ ایک گھنٹہ کی مشق باوضو قبلہ رو بیٹھ کر ہو مگر اس کے علاوہ خواہ وضو ہو یا نہ ہو (اگرچہ باوضو ہر وقت رہنا طہارت باطنی میں بہت مؤثر اور اس کے لیے بہت کارآمد ہے) کھڑے بیٹھے لیٹے ہوئے حتی کہ پاخانہ پیشاب کرتے ہوئے سانس کے ساتھ ذکر جاری ہے۔ کرتے کرتے

ایسی عادت ہو جاتی ہے کہ سوتے ہوئے بھی ذکر جاری رہتا ہے، عمر عزیز کا جو حصہ بھی ذکر میں گزرے وہی زندگی ہے اور وہی مفید ہے۔

اس میں کوتاہی ہرگز ہرگز نہ کیجیے۔ نفس پر زور ڈال کر اس میں مشغول رہیے اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال ہوگی دنیوی جھنجٹوں کے ہوتے ہوئے جد وجہد جاری رکھیے مایوس مت ہوجیے۔ کوشش کیجیے۔ کہ ناغہ نہ ہو اور تسلسل جاری رہے ؎

صبر کن حافظ بسختی روز و شب　　　عاقبت روزے بیابی کام را

(الفرقان بابت جمادی الاخریٰ ۷۷ھ)

جو شیخ طریقت اپنے مسترشدین کو ہر وقت ذکر اللہ میں مشغول رہنے کی تلقین اور تاکید فرماتا ہو پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس کا اپنا کوئی وقت ذکر اللہ سے خالی ہو اور غیر اللہ میں مشغول ہو۔

اور یہی عبادت کی حقیقت ہے کہ انسان کا دل ہر وقت یاد الٰہی سے معمور رہے اور ہر وقت اوامر خداوندی کے امتثال اور بجا آوری کے لیے تیار رہے۔

مولانا فخر الحسن صاحب مدرس دار العلوم دیوبند بیان فرماتے تھے کہ میں نے ایک رمضان حضرت مدنی رح کے پاس گزارا۔ وہاں حضرت مدنی رح کا رنگ ہی دوسرا پایا۔ صرف چند گھنٹے آرام فرماتے تھے باقی سارا وقت عبادت و تلاوت اور ارشاد و تلقین میں صرف ہوتا تھا۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ تراویح خود پڑھاتے تھے بارہ بجے تراویح سے فراغت ہوتی اس کے بعد آدھ گھنٹہ پون گھنٹہ آرام فرماتے پھر نماز تہجد کے لیے اٹھ جاتے اور دن بھر قرآن مجید کی تلاوت میں مشغول رہتے تھے۔

اتباع شریعت و سنت:

انسان کی انسانیت اور اصلاح و درستی اتباع شریعت اور اتباع سنت پر موقوف اور منحصر ہے۔ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سابقہ مکتوب گرامی میں تحریر فرماتے ہیں آپ ذکر اور اتباع شریعت و سنت پر مداومت کرتے رہیے انشاء اللہ اصلاح رفتہ رفتہ ہوجائے گی "سید الانبیاء والمرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی لائی ہوئی شریعت انسانیت اور انسانی زندگی کا مکمل دستور العمل ہے اور آپ کی حیات طیبہ اس دستور العمل کی عملی تفسیر و تشریح ہے۔

پس انسانیت ساری کی ساری شریعتِ محمدی اور سنت نبوی میں سموئی ہوئی ہے اور جو کام بھی شریعت و سُنّت کے خلاف ہے وہ انسانیت سے بعید اور سراسر بہیمیت اور کھلی شیطنت ہے اسی لیے جو بھی انسان بنا وہ شریعتِ محمدی اور سُنّتِ نبوی کی پیروی سے بنا اور جس قدر شریعت و سُنّت کا اتباع کیا اسی قدر انسانیت سے آراستہ ہوا۔

حضرت مدنی کی زندگی بھی اس دور میں شریعتِ محمدی اور سُنّتِ نبوی کا بہترین نمونہ تھی اسی لیے ان کی ہر ادا سے اِنسانیت نمایاں تھی اور دیکھنے والا پہلی نگاہ میں بھانپ لیتا تھا کہ واقعی انسان ایسے ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ غیر مسلم بھی آپ سے ملتا تھا تو وہ آپ کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔

ایک غیر مُسلم جو کالج کے پروفیسر ہیں اور گلاوٹھی کے رہنے والے ہیں میرے پاس آتے ہیں اور بار بار نہایت محبت و عقیدت کے ساتھ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ کرتے ہیں راقم نے ان سے دریافت کیا کہ آپ کو حضرت مدنی سے کس طرح واقفیت ہے تو کہا کہ ۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں جب کشت و خون کا بازار گرم تھا اور ہندو مسلمانوں میں عام منافرت پھیلی ہوئی تھی مجھے معلوم ہوا کہ مولانا مدنی گلاوٹھی آئے ہیں اور جامع مسجد میں جلسہ ہے میں بھی اسلامی لباس تبدیل کر کے وہاں پہنچا کہ دیکھوں کیا کہتے ہیں؟ آپ اس وقت باہم محبّت و اتحاد سے رہنے کی تلقین کر رہے تھے اور غیر مسلم پڑوسیوں کے حقوق بیان کر رہے تھے میں نے ان کی باتیں سنتے ہی کہا واقعی انسان ایسے ہوتے ہیں اور یہی اصل مُسلمان ہیں اس وقت سے مجھے ان کے ساتھ محبّت و عقیدت ہے۔

اتباعِ شریعت و سُنّت حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی طبیعت اور فطرت بن چکا تھا حتیٰ کہ دوسروں کا بھی شریعت و سُنّت کے خلاف عمل ناقابل برداشت ہوتا تھا۔ اسی لیے خلافِ شرع صورت اور سیرت والے سامنے جاتے ہوئے گھبراتے تھے۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ چاہتے تھے کہ ہر مسلمان شریعت و سُنّت کا پابند ہو اور انسانیت سے آراستہ ہو اسی لیے خلافِ شرع اُمور پر سختی فرماتے تھے مثلاً آپ کو اصرار تھا کہ نکاح میں مہر فاطمی باندھا جائے اور جو لوگ اس پر رضامند نہ ہوتے تھے آپ نکاح نہ پڑھاتے تھے۔ عزیزان گرامی مولانا محمد یوسف صاحب و مولانا انعام الحسن صاحب کا جیب

سہارنپور میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ کی صاحبزادیوں سے عقد ہوا تو حضرت مدنیؒ نے حسب عادت مہر فاطمی پر اصرار فرمایا اور مہر فاطمی مقرر ہوا حالاں کہ ہمارے یہاں خاندان میں مہر مثل کا دستور تھا اس کے چند روز بعد میری حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے غازی آباد کے اسٹیشن پر ملاقات ہوئی تو میں نے عرض کیا کہ جب فقہا کے یہاں اصل مہر مثل ہے تو پھر حضرت کو مہر فاطمی پر اس قدر کیوں اصرار ہے؟ ارشاد فرمایا یہ صحیح ہے کہ اصل مہر مثل ہی ہے مگر چوں کہ لوگ خلاف شرع حد سے زیادہ مہر باندھنے لگے اس لیے ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم سختی کے ساتھ سنت کی پابندی کریں اور دوسروں کے لیے مثال قائم کریں" اسی طرح حضرت مدنی تقریبات میں رسومات کی پابندی کو سراسر ہلاکت و بربادی سمجھتے تھے اور اپنے سے تعلق رکھنے والوں کی تقریبات بے رسم و رواج کے شریعت و سنت کے مطابق سادگی سے ساتھ کراتے تھے اور آپ کی خود اپنی تقریبات بھی دوسروں کے لیے شریعت و سنت کی زندہ نمونہ تھیں۔

اسی طرح حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے باہمی نزاعات اور معاملات باہمی تصفیہ سے شریعت کے مطابق طے ہو جائیں اور مقدمہ بازی کی نوبت نہ آئے اور اس سلسلے میں اپنی ظاہری توہین و تذلیل کی بھی پروا نہ کرتے تھے حضرت مدنیؒ نے ایک مرتبہ ایک معاملے میں مصالحت کرانی چاہی ایک فریق کی جانب سے انتہائی توہین و تحقیر کا برتاؤ کیا گیا، میں نے عرض کیا "حضرت اس معاملے میں نہ پڑیں اس میں تو بڑی ذلت ہے ارشاد فرمایا" کیوں اس سے بڑھ کر کیا عزت ہو سکتی ہے کہ دو بھائیوں کے درمیان شریعت کے موافق مصالحت ہو جائے"۔

حضرت مدنیؒ عبادات ہی نہیں بلکہ عادات؛ کھانے پینے سونے جاگنے چلنے پھرنے اور پہننے اوڑھنے میں بھی شدت کے ساتھ سنت کا اتباع فرماتے تھے تاکہ عادات عادات نہ رہیں بلکہ عبادات میں شامل ہو جائیں اور ہر بات میں رنگ بندگی نمایاں ہو جو انسانیت کی اصلی روح ہے اور مسلمان کی اصلی شان ہے اور اس سے وہ لوگ اچھی طرح واقف ہیں جنھیں حضرت مدنی کے یہاں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی یا حضرت کے ساتھ رہنے کا کبھی اتفاق ہوا اس لیے کہ اتباعِ سنت کثرتِ مداومت کی وجہ سے حضرت مدنی کی طبیعت اور مزاج بن چکا تھا۔

عزم واستقلال:

کوئی شخص ماں کے پیٹ سے بڑا آدمی بن کر نہیں نکلتا۔ بڑا آدمی بننے کی قابلیت و صلاحیت ہر ایک میں موجود ہوتی ہے پھر جوان صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا ہے اور عزم واستقلال اور ہمت و حوصلے سے کارِ نمایاں انجام دیتا ہے وہی بڑا انسان شمار ہوتا ہے۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی پر جب نظر ڈالی جاتی ہے تو وہ عزم واستقلال اور ہمت و حوصلہ کے کوہِ ہمالیہ نظر آتے ہیں جو کام بھی انجام دیا پورے عزم واستقلال اور انتہائی ہمت و حوصلے کے ساتھ انجام دیا، جس کی نظیر دوسری جگہ نہیں مل سکتی اور تفصیل کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ وہ بوڑھے اور ضعیف ہو جانے کے باوجود عزم و استقلال اور ہمت و حوصلے میں جواں مرد تھے جو تمام جوان مردوں سے سبقت لے گئے تھے۔

برطانیہ کا جس شان سے مقابلہ کیا وہ اپنی آپ ہی نظیر ہے۔ حصولِ آزادی کے لیے جو جد و جہد کی اس کا کوئی نمونہ پیش نہیں کر سکتا۔ پھر ہندوستان میں مسلمانوں کی حیثیت و وقعت برقرار رکھنے کے لیے جو کارنامے انجام دیے وہ آپ ہی کا حصہ تھا۔ اگر کچھ اور زندہ رہتے تو کچھ کا کچھ کر جاتے جو برطانیہ کی سنگینوں سے ڈرنے والا نہ تھا وہ ہندوستانی حکومت سے کسی حالت میں بھی مرعوب نہیں ہو سکتا تھا بے پناہ جذبات تھے جن کو بروئے کار لانے کے لیے وقت درکار تھا۔ حصولِ آزادی کے بعد ایک مرتبہ میں نے حضرت مدنی کی خدمت میں عرض کیا کہ اب تو حضرت کی حکومت بن گئی، ہنس کر فرمایا "ہمارے لیے تو پہلے بھی جیل خانہ تھا اور اب بھی جیل خانہ ہے" اس ایک ہی فقرہ سے اندرونی سارے جذبات اور رجحانات کا بخوبی پتا چلتا ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی موجودہ حیثیت بھی حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے عزم و استقلال کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے ورنہ نہ معلوم مسلمانوں کی تباہی اور مسجدوں، خانقاہوں مدرسوں کی بربادی کس حد تک پہنچتی اور نقشہ کیا سے کیا ہو جاتا۔

۱۹۴۷ء کے خونی ہنگامہ میں جب ہر شخص کو اپنی اپنی پڑ رہی تھی اور مسلمان کے لیے کوئی جائے امان نظر نہ آتی تھی حضرت مدنی پورے عزم واستقلال اور ہمت و حوصلے

کے ساتھ ہندوستان میں مسلمانوں کو جمانے کی کوشش میں معروف تھے اور پورے وثوق کے ساتھ مسلمانوں کے ہند میں رہنے کی تلقین فرمارہے تھے، ایک آہنی دیوار بن کر سہارنپور کی سرحد پر جم گئے اور اس تباہی کے آگے بڑھنے کی پوری روک تھام کی اس وقت آپ جہاں مسلمانوں کو ہمت و استقلال کا سبق پڑھارہے تھے وہاں حکومت کی کوتاہیوں پر بھی سخت تنبیہ اور باز پرس کررہے تھے، اسی دوران میں جب کاندھلہ تشریف لائے تو میں نے عرض کیا کہ ہندوستان کو چھوڑنا تو نہیں ہے لیکن یہ فرمائیے کہ یہاں کس طرح ٹھہرا جائے؟

ارشاد فرمایا "ہمت و حوصلہ اور عزم و استقلال کے ساتھ خدا پر بھروسہ رکھو"

۱۹۴۷ء کے فسادات کے دوران میں آپ نے پنڈت پنت وزیر اعلیٰ یوپی سے سخت غضبناک لہجہ میں حکومت کے رویہ کے خلاف باز پرس کی تو پنڈت پنت نے کہا کہ دارالعلوم کی حفاظت کے لیے فوج بھیج دی جائے تو حضرت مدنی نے سخت غصہ میں فرمایا "دارالعلوم تو خدا کا ہے وہ خود اس کی حفاظت کرے گا آپ سہارنپور کی خبر لیجیے اگر آپ مسلمانوں کا تحفظ کرنے کے بارے میں مذبذب ہیں یا اس میں ناکامی کا اندیشہ ہے تو آپ مجھے اجازت دیدیں میں مسلمانوں سے کہہ دوں گا کہ وہ اپنا تحفظ خود کرلیں۔ ان تہدیدی کلمات کے بعد جدید انتظامات مکمل کیے گئے اور فسادات کی بھڑکتی ہوئی آگ آگے بڑھنے سے رک گی۔

انہماک مشاغل:

جب انسان بڑے کارناموں سے نپٹتا ہے تو جس قدر بڑا انسان ہوگا اسی قدر اس کے مشاغل کثیر ہوں گے اور انہی کی بقدر انہماک و اشتغال ہوگا جو واقعی انسان ہیں وہ ہر وقت انسانی کارناموں میں معروف رہتے ہیں اور نقلی انسان تو صرف کھانے پہننے والا حیوان ناطق ہوتا ہے۔ ہر انسان چل دیتا ہے اور اس کے اعلیٰ مشاغل اور کارنامے اس کی یادگار رہ جاتے ہیں جو دوسروں کے لیے مشعلِ راہ بنتے ہیں۔

حضرت مدنی نوراللہ مرقدہٗ کے روزانہ کے معمولات اور مشاغل اس طرح بیان کیے گئے ہیں۔ دیوبند کے قیام میں روزانہ آخر شب میں تقریباً تین بجے بیدار ہوتے اور نماز فجر تک تہجد اور اوراد و وظائف میں مشغول رہتے۔ نماز فجر کے بعد تقریباً ایک گھنٹہ تک

تلاوت قرآن کریم اور مطالعۂ کتب اس کے بعد مہمانوں کی معیت میں چائے اور ناشتہ پھر تقریباً ۱۲ بجے تک دار العلوم میں درس حدیث اور صدر مدرسی کے فرائض کی انجام دہی اس کے بعد مہمانوں کے ساتھ کھانا تناول فرماکر تھوڑی دیر قیلولہ فرماتے۔ بعد نماز ظہر ڈاک ملاحظہ فرماتے خطوط کا جواب خود لکھتے یا دوسرے سے لکھواتے اور مہمانوں سے گفتگو فرماتے اور ان کی مختلف ضرورتوں اور گوناگوں مشکلات کو رفع فرماتے۔ کسی کو سلوک کی تلقین ہورہی ہے اور کسی کو تعویذ دیا جارہا ہے اور کسی کے سوالات کا جواب دیا جارہا ہے یہ سلسلہ نماز عصر تک برابر جاری رہتا تھا اور اس میں سادی چائے کا دور بھی چلتا تھا۔ عصر سے مغرب تک دار العلوم میں درس حدیث ہوتا تھا نماز مغرب کے بعد تقریباً ایک گھنٹہ نوافل میں صرف ہوتا جس میں سوا پارہ یومیہ تلاوت فرماتے اور فوراً ہی نماز عشاء کی تیاری شروع ہوجاتی۔ عشاء کی نماز کے بعد مہمانوں کے ساتھ کھانا تناول فرماتے اس کے بعد دار العلوم میں تقریباً تین گھنٹے بخاری شریف کا درس جاری رہتا تھا تو گویا رات کے تین بجے سے لے کر رات کے ۱۲ بجے تک اکیس ۲۱ گھنٹے مشغولیت میں گزرتے تھے صرف آدھ گھنٹہ پون گھنٹہ دوپہر کو آرام ملتا تھا سب سے زائد مشغولی کا وقت ظہر و عصر کے درمیان کا ہوتا تھا ڈاک کا انبار سامنے ہوتا تھا اور مہمانوں کا ہجوم پیش نظر چوبیس ۲۴ چالیس ۴۰ سے کبھی کم نہ ہوتے تھے ہر ایک کی ضرورت کا معلوم کرنا پھر اس کو نہایت بشاشت اور خندہ پیشانی کے ساتھ پورا کرنا ہر ایک کے حقوق مہمانی کو ادا کرنا کوئی معمولی کام نہیں۔ ڈاک بھی اس کثرت سے ہوتی تھی کہ پانچ پانچ سو کا انبار سامنے آجاتا تھا اس لیے کہ حضرت مدنیؒ بیک وقت شیخ طریقت بھی تھے اور عالم دین بھی اور عامل کامل بھی اور سیاسی پیشوا بھی، انھی سب امور کے متعلق تحریری اور زبانی لوگوں کی فرمائش اور استفسارات بھی ہوتے تھے جن کو حضرت پورا فرماتے تھے۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ میری بیماری کا علاج بذریعہ عملیات شروع فرمایا بار بار حالات لکھتا اور حضرت مفصل عملیات جواب میں تلقین فرماتے ان آخیر میں خود بھی حضرت کی مشغولی کو دیکھ کر خاموش ہوگیا مگر حضرتؒ نہ کبھی گھبرائے اور نہ کبھی کسی قسم کی گرانی یا مشغولی کا عذر فرمایا اور یہی ہر ایک کے ساتھ دستور العمل تھا۔

یہ روزمرہ کے مشاغل تھے جن کو کوئی جوانمرد بھی چند روز نہیں نبھا سکتا جو ایک پیر مردِ ضعیف بیماری کی حالت میں سالہا سال نبھا گیا اور کرکے دکھلا گیا جو کھلی کرامت ہے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ حضرت مدنیؒ اپنے ان تھکا دینے والے مشاغل سے نہ کبھی اکتاتے تھے نہ گھبراتے تھے نہ کبھی اس کا احساس فرماتے تھے۔ حضرت مدنیؒ جانتے تھے کہ انسان کام ہی کے لیے بنا ہے اور کام ہی سے انسان بنتا اور سنورتا ہے۔ کثرتِ اسفار کے باوجود ان مشاغل پر مداومت کرامت نہیں تو اور کیا ہے۔ شاید ہی حضرت مدنیؒ کی برابر کسی نے سفر کیے ہوں سال کا تقریباً نصف حصہ سفر میں گزرتا تھا اور سفر کے مشاغل اور مصروفیتیں حضر سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہیں۔

احساس فرض منصبی:

وہ شخص انسان ہی نہیں جس میں اپنے فرض منصبی اور ذمہ داری کی ادائیگی کا احساس نہیں جو شخص بھی جس قدر انسانیت سے آراستہ ہوا اسی قدر اپنے فرض منصبی اور ذمہ داری کی ادائیگی میں چست و چالاک ہوا حضرت مدنیؒ ۳۲ سال دارالعلوم دیوبند کی صدر مدرسی کے منصب پر فائز رہے اس دوران میں جس انہماک اور سرگرمی کے ساتھ آپ نے اپنی اس ذمہ داری کو پورا فرمایا اس کی کوئی نظیر پیش نہیں کر سکتا۔ وہ اپنی آپ ہی مثال ہے۔ درس کے اوقات پہلے معلوم ہو چکے روزانہ ۔ ۸ گھنٹہ درس دینا کوئی معمولی کام اور ہر ایک کے بس کی بات نہیں پھر درس بھی پورے نشاط اور انبساط کے ساتھ ہوتا تھا دو سو ڈھائی سو طالب علموں کا مجمع سامنے ہوتا تھا ہر ہر مسئلے کی پوری پوری تحقیق و تشریح ہوتی تھی اور ہر طالب علم کے سوال کا جواب تسلی بخش دیا جاتا تھا جس میں کافی وقت صرف ہوتا تھا۔

دیوبند کے قیام میں درس اسباق میں تساہل تو درکنار سفر میں بھی ہمیشہ درس کا فکر لاحق رہتا تھا اور کوشش ہوتی تھی کہ جلد از جلد دیوبند پہنچ کر سبق پڑھایا جائے۔ جب بھی ہر قریب و بعید سفر سے واپسی ہوتی اور درس کا وقت ہوتا اسی وقت سبق کا اعلان ہو جاتا تھا اور درس شروع ہو جاتا نہ کوئی تکان محسوس ہوتی تھی اور نہ اضمحلال کا کوئی اثر ظاہر ہوتا تھا حتیٰ کہ سفرِ حج سے جب واپسی ہوئی جس کی تکان مہینوں نہیں اترتی اور دماغ پراگندہ رہتا ہے اور واپسی بھی اسی طرح ہوئی کہ جس ٹرین سے حضرت تشریف لائے وہ دیوبند کے اسٹیشن پر نہ رکتی تھی اس لیے رات کو ۲ بجے مظفر نگر اسٹیشن پر اترے اور

وہاں سے بذریعہ لاری دو بجے دیوبند پہنچے اس طویل سفر سے واپسی، رات کی بیداری اور ملاقات کے لیے آنے والوں کا ہجوم، پھر بھی سبق کا اعلان ہوگیا اور مسلسل کئی گھنٹے درس جاری رہا اور اس شان سے بخاری شریف شروع کرائی گئی جو آپ ہی کا حصّہ تھا۔

درس حدیث کے علاوہ دارالعلوم کے انتظامی اور تعلیمی و تبلیغی اُمور کو بھی حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیا جاتا تھا اور ہر ایک کام کی پوری نگرانی ہوتی تھی دارالعلوم کی ترقی اور عروج و فروغ میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی اور اسلام کی جو علمی یادگار آپ کی سپردگی میں دی گئی تھی اس کو اوج کمال پر پہنچایا اور دنیا میں اس کے نام کو روشن کردکھایا۔ حضرت مدنیؒ نے مالٹا کی اسیری سے رہائی کے بعد سے جمعیۃ علمائے ہند کی سیاسی سرگرمیوں میں حصّہ لینا شروع کردیا تھا اور اخیر میں تو کئی برس سے جمعیۃ علمائے ہند کے مستقل صدر تھے یہ صدارت بھی خطبۂ صدارت پڑھ دینے والی صدارت نہ تھی بلکہ اس صدارت کی ذمّہ داری کا پورا احساس تھا اور اسی احساس نے جمعیۃ علمائے ہند کو ایسے نازک دور میں بھی سنبھالے رکھا جب خود اپنے اس کے وجود کو ختم کردینے پر تُلے ہوئے تھے اس دوران میں جو سیاسی کارنامے جمعیۃ علمائے ہند نے آپ کی سرکردگی میں انجام دیے انھی کی بدولت آج عالمِ اسلام میں مسلمانانِ ہند کا سر بلند و بالا ہے اگر حضرت مدنی کی ہستی سیاسی سرگرمیوں میں اس قدر سرگرم عمل نہ رہتی تو کس کو معلوم ہوتا کہ اس تحریک آزادی میں مسلمانانِ ہند کا پورا حصّہ ہے جس کی بنیاد خود مسلمانوں نے ڈالی اور اپنی جانبازیوں اور سرفروشیوں سے اس کو منتہیٰ تک پہنچایا۔

ہندوستان میں کوئی مُسلم یا غیر مُسلم سیاسی سرگرمیوں اور ملکی قربانیوں اور جانبازیوں میں حضرت مدنی کی ہم سری کا دعویٰ نہیں کرسکتا بلکہ حق یہ ہے کہ اس مردِ مجاہد نے تحریک آزادی میں وہ کام انجام دیا جس کو بڑی جماعت بھی انجام نہ دے سکتی تھی اور جب اس کام کے برگ و بار نمایاں ہوئے اور پھل سامنے آیا تو صاف اپنا دامن بچا کر یکسو ہوگیا اور ساری پونجی دوسروں کے حوالے کردی جو بے غرضی اور خدانیت کی کھلی دلیل اور یکتا مثال ہے۔

سادگی و بے تکلفی:

سادگی اور بے تکلفی بھی انسانی اعلیٰ جوہر ہے جو انسانیت سے آراستہ کرتا ہے۔

حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ سادگی اور بے تکلفی میں بھی یکتائے روزگار تھے۔ شیخ طریقت ربانی عالم ربانی ہونے کے علاوہ حضرت مدنیؒ کی ظاہری شخصیت ایک بڑے سیاسی رہنما کی تھی اور ہر سیاسی لیڈر مسلم ہو یا غیر مسلم ملکی ہو یا غیر ملکی آپ کے آستانہ پر حاضری کو ضروری اور باعثِ فخر سمجھتا تھا۔ اس ظاہری عزت و اقتدار کے باوجود اپنی درویشانہ شان اور بوریا نشینی کو برقرار رکھنا اور سُنّتِ نبوی کے موافق سادگی کے ساتھ زندگی گزارنا صرف آپ ہی کا عالی حوصلہ تھا یہاں بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں اور اپنی راہ سے بھٹک جاتے ہیں۔

حضرت مدنیؒ کا لباس وضع قطع رہائش، بود و باش سب تکلیف اور سادہ تھا اور سنت نبوی کا بہترین نمونہ آپ سُنّت کے موافق چمڑے کا تکیہ استعمال فرماتے تھے اور چمڑے کا گول دسترخوان استعمال ہوتا تھا جس پر ہمیشہ ایک قسم کا سالن ہوتا تھا اور دائرہ کی شکل میں دس بارہ آدمی دسترخوان کے گرد بیٹھ کر ایک ہی برتن میں ساتھ کھاتے تھے ان میں سے ایک حضرت بھی ہوتے تھے اور باقی مہمان بلا امتیاز امیری و غریبی کے ساتھ ہوتے تھے اور ساتھ کھاتے تھے۔ صبح کو ناشتہ چائے کے ساتھ باسی روٹی اور مرچ کا اچار ہوتا تھا۔ یہی حضرتؒ کا ناشتہ تھا اور یہی تمام مہمانوں کا۔ ایک مرتبہ میں صبح کے ناشتے پر موجود تھا اول تو مجھے بیماری کی وجہ سے باسی روٹی کھانے میں تامل ہوا پھر تکلفاً ایک آدھ لقمہ کھانا شروع کیا تو اس قدر مزہ دار معلوم ہوا کہ چھوڑنا مشکل ہو گیا اس کے بعد حضرت نے کھانے والوں کو مخاطب کر کے فرمایا ہم آپ حضرات کے یہاں جاتے ہیں تو آپ ناشتہ میں مرغ اور حلوے کھلاتے ہیں اور یہاں باسی روٹی کھانی پڑتی ہے۔ اس پر میں نے عرض کیا کہ حضرت یہ باسی روٹی اور اچار مرغ سے زیادہ مزہ دار ہے۔

تواضع و انکساری:

انسان کی انسانیت اور برتری و سربلندی کا اصلی راز تواضع اور انکساری میں مضمر ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جو شخص بھی اللہ تعالیٰ کے لیے تواضع اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو ضرور رفعت و سربلندی عطا فرماتے ہیں۔ یہی تواضع و انکساری اصلی شان عبدیت ہے جو شخص بھی اپنی حقیقت کا شناسا ہوگا وہ مجسمہ تواضع ہوگا اور کبر و بڑائی سے بالکل مبرا ہوگا جو عبدیت کے بالکل منافی اور متضاد ہے۔

حضرت مدنیؒ بھی تواضع اور انکساری کا ایک مجسمہ تھے کبھی صدر مقام پر نہ بیٹھتے تھے اور اور ہمیشہ نشست کے لیے مجلس کا گوشہ اختیار فرماتے تھے ہر ایک چھوٹے بڑے کو "آپ" کے لفظ کے ساتھ خطاب کرتے تھے اور ہمیشہ اس انداز سے گفتگو فرماتے کہ گویا چھوٹا اپنے بڑے

کررہا ہے" اور ہر ایک کے ساتھ گفتگو کا یہی انداز تھا گویا سب بزرگ تھے۔ اور یہ خود ہر کام کے لیے خود سبقت کرتے اور ہر محنت و مشقت کے لیے اپنے کو پیش کرتے اس کا کچھ اندازہ اس ایک واقعے سے ہو جاتا ہے۔

جب حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہٗ کی دوسری شادی حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی صاحبزادی سے نظام الدین میں ہوئی تو حضرت مدنی بھی شرکت کے لیے تشریف لا رہے تھے۔ میں شیخ رشید احمد تاجر اسلحہ کی کار لے کر دہلی جنکشن پہنچا۔ اسی گاڑی سے متولی طفیل احمد بھی نکاح میں شرکت کے لیے اُترے اور ایک صاحب حضرت مدنیؒ کے ہمراہ تھے کار چھوٹی تھی اور اس میں نہایت دشواری کے ساتھ چار آدمی اور سامان آسکتا تھا اس لیے ڈرائیور نے چار آدمی بٹھانے سے انکار کر دیا حضرتؒ نے فرمایا تم متولی صاحب کو لے کر کار میں چلے جاؤ اور میں تانگے سے آتا ہوں میں نے اصرار کیا کہ حضرت کار میں تشریف لے جائیں اور ہم تانگے سے آتے ہیں جب حضرت نے اس کو کسی طرح منظور نہ فرمایا تو میں نے چاہا کہ جس طرح بھی ہو سب کار میں چلیں اور غصہ میں ڈرائیور کو خوب ڈانٹا حتیٰ کہ زبان سے حرام زادہ بھی کہہ دیا، مگر کچھ نہ ہوا، کار خالی نظام الدین واپس گئی اور حضرت تانگے سے نظام الدین پہنچے، نظام الدین پہنچ کر شیخ رشید احمد نے اس کی معذرت چاہی تو حضرت مدنیؒ نے فرمایا ڈرائیور کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں (میری طرف اشارہ کر کے) انھوں نے بہت کافی ڈانٹ دیا ہے میں نے شرمندہ ہو کر عرض کیا میں نے تو جو کچھ بھی کہا حضرتؒ کی طرف سے کہا اس پر ہنس کر فرمایا جی ہاں حد بھی مجھی پر جاری کرانا (چونکہ میں نے حرام زادہ کہا تھا) حضرت مدنیؒ کی اس بلاوجہ مشقت اور تکلیف پر سب متاثر تھے مگر حضرتؒ کو اس کا خیال بھی نہ تھا۔

یہ ایک واقعہ نمونے کے طور پر لکھ دیا گیا ورنہ اس قسم کے واقعات حضرتؒ کی زندگی میں سیکڑوں ملیں گے۔ غایت تواضع اور انکساری کی وجہ سے حضرت مدنیؒ اپنے مخالفین اور معاندین کا بھی ہمیشہ اچھے الفاظ کے ساتھ تذکرہ فرماتے تھے اور کسی کو برے لفظ سے یاد نہ کرتے تھے حتیٰ کہ گورنمنٹ برطانیہ جس کی عداوت و نفرت آپ کی فطرت بن چکی تھی اس کو بھی ہمیشہ ہماری مہربان گورنمنٹ فرمایا کرتے تھے اگرچہ اس لفظ مہربان گورنمنٹ میں پورا طنز ہوتا تھا اور بعد کی تقریر میں گورنمنٹ برطانیہ کی تمام مہربانیوں کا راز فاش ہوتا تھا۔

حضرت مدنیؒ کی یہی خاکساری اور انکساری تھی جس نے مخلوق خدا کو آپ کا گرویدہ اور

شیدائی بنا رکھا تھا اور آپ ہر ایک کے سردار اور سرتاج بنے ہوئے تھے۔

حضرت مدنیؒ کے بڑے بھائی حضرت مولانا سید احمد رحمۃ اللہ علیہ بھی تواضع وانکساری میں حد سے تجاوز کیے ہوئے تھے باوجودکہ ان کو مدینہ منورہ میں پورا اقتدار حاصل تھا پھر بھی ہمیشہ مسکین صورت اور مسکین سیرت بنائے رکھتے تھے اور درویشانہ زندگی بسر فرماتے تھے ایک مرتبہ خود مجھے امیر مدینہ نے کہا کہ "میں تو برائے نام امیر ہوں اصل امیر تو سید احمد ہیں جو سب کے قلوب پر حکومت کر رہے ہیں۔

اس انتہائی خاکساری کے باوجود حضرت مدنیؒ وقار و تمکنت کا کوہ نور تھے۔ ایک خاص نوع کا ہیبت وجلال چہرۂ مبارک پر عیاں تھا! باوجودکہ حضرت مدنیؒ ہنس ہنس کر کے باتیں فرماتے تھے مگر دل اندر سے لرزتا رہتا تھا اور بمشکل بات کی جاتی تھی یہ میرا حال تھا جو اپنی نالائقی کی وجہ سے تمام بزرگوں سے بے تکلف بات کرنے کا عادی تھا حتی کہ حضرت تھانوی کے یہاں بھی بے دھڑک جو بھی میں آتا تھا کہہ دیتا تھا اور حضرت تھانویؒ کی طرف سے کبھی کسی گرانی اور ناگواری کا بھی اظہار نہیں ہوا۔"

میں نے حضرت مدنیؒ کے ہم عصر بزرگوں کی زبان سے اکثر یہ فقرہ سُنا ہے "حضرت مدنیؒ سے ڈر لگتا ہے" بارہا ایسا ہوا کہ حضرت مولانا محمد الیاس کسی خاص مقصد اور بات کے لیے دیوبند تشریف لے گئے وہاں حضرت مدنیؒ سے بے تکلف ملاقات ہوئی اور ہنس ہنس کر باتیں ہوئیں، مگر مقصد کی بات زبان پر نہ آئی اور واپسی کے بعد فرمایا "حضرت مدنیؒ سے بات کرنے کی ہمت ہی نہ ہوئی"، بعض جلیل القدر بزرگ مشائخ طریقت محض اس لیے گاڑھا پہننے کا اہتمام فرماتے تھے کہ شاید حضرت مدنیؒ سے ملاقات ہو جائے اور ولائتی کپڑے سے ان کو گرانی اور ناگواری ہو میں نے میرٹھ میں بعض سمجھ دار دوستوں کو مشورہ دیا کہ وہ دیوبند حضرت مدنیؒ کی زیارت کے لیے جائیں تو انھوں نے یہی عذر پیش کیا کہ حضرت مدنیؒ کے یہاں جاتے ہوئے تو ڈر محسوس ہوتا ہے۔ یہ تھا حقانی ہیبت وجلال جو حضرت مدنیؒ کے چہرہ مبارک پر نمایاں تھا۔

ایثار و قربانی:

ایثار و قربانی بھی ایک اعلیٰ جوہر انسانی ہے جس سے انسانیت پروان چڑھتی ہے اسی لیے قرآن کریم میں مومنین خالصین کا وصف بیان کیا گیا ہے۔ ویؤثرون علیٰ انفسھم

ولو کان بہم خصاصۃ (اور ایثار کرتے ہیں وہ اپنے نفسوں پر اگرچہ خود ان کے لیے تنگی ہو)

حضرت مدنیؒ بھی ایثار و قربانی کا مجسمہ تھے ان طلبہ کے لیے اخراجات کی خود کفالت فرماتے تھے جن کا دارالعلوم سے وظیفہ نہیں ہو سکتا تھا اور اپنے ملنے والوں کی ضرورتوں کو خفیہ طور پر پوری فرماتے تھے بارہا یہ معلوم ہوا کہ اپنے رفقائے سفر کے تمام اخراجات حضرت مدنیؒ خود برداشت فرماتے تھے اور ان کے راحت و آرام کا پورا انتظام فرماتے تھے۔ اتنا تو میں نے بھی دیکھا ہے کہ سفروں میں اخراجات کے وقت سب سے پہلے حضرت مدنیؒ کا ہاتھ جیب میں جاتا تھا اور بٹوا نکال کر زبردستی وہ اخراجات اپنے پاس سے پورے فرماتے تھے

حضرت مدنیؒ ہمیشہ اپنی ضرورتوں کو اپنے پاس سے پوری فرماتے تھے اور اس معاملے میں بہت سختی برتتے تھے اور جو ہدایا دوسروں کی طرف سے آتے تھے بے دریغ ان کو رفقا پر خرچ فرما دیتے تھے۔

یہ ایثار و قربانی بھی حضرت مدنیؒ کو شاید ورثے میں ملی تھی اس لیے کہ حضرتؒ کے بڑے بھائی حضرت مولانا سید احمدؒ بھی سراپا ایثار و قربانی تھے جس کی نظیر نہیں ملتی تھی اور اس وقت حضرتؒ کے چھوٹے بھائی مولوی سید محمود احمد صاحب بھی ایثار و قربانی کی ایک زندہ مثال ہیں۔

فیاضی و مہماں نوازی:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ اپنے مہمان کا اکرام کرے (مسلم شریف)

پس معلوم ہوا کہ مہمان کا اعزاز و اکرام ایمان کا خاصہ ہے اور یہی انسانیت و شرافت کا اصلی تقاضا ہے کہ اپنے پاس آنے والے کا ہر طرح اعزاز و اکرام کیا جائے۔ اور فیاضی و فراخ دلی برتی جائے۔

حضرت مدنیؒ کی فیاضی اور مہمان نوازی بھی حد سے بڑھی ہوئی تھی اور اپنی آپ ہی مثال تھی۔ جس سے وہ لوگ بخوبی واقف ہیں جن کو کبھی حضرت کے آستانے پر حاضری کی سعادت نصیب ہوئی، روزانہ کم و بیش چالیس مہمان حضرت کے دستر خوان پر ہوتے تھے جو مختلف خیالات اور مختلف اطراف کے ہوتے تھے حضرت ہر ایک کا پورا پورا اعزاز و اکرام فرماتے تھے

اور نہایت فیاضی اور فراخ دلی کے ساتھ خرچ کرتے تھے کھانا اگرچہ ایک ہی ہوتا تھا مگر لذیذ اور مزے دار ہوتا تھا حضرتؒ دونوں وقت کھانا مہمانوں کے ساتھ کھاتے تھے اور خود بھی وہی کھاتے تھے جو مہمانوں کو کھلاتے تھے کھانے میں کسی کی تفریق نہ ہوتی تھی جو ہوتا تھا سب کے لیے یکساں ہوتا تھا اور اگر کوئی خاص چیز پکوائی جاتی تھی تو سب مہمانوں کے لیے پکوائی جاتی تھی۔

میں نے سنا ہے کہ رمضان المبارک میں چونکہ مہمانوں کی تعداد سیکڑوں ہوتی تھی اور سب کے لیے دودھ کی کسی چیز کا انتظام نہ ہو سکتا تھا اس لیے حضرت خود بھی کوئی دودھ کی غذا استعمال نہ فرماتے تھے اور متعلقین کے اصرار پر فرما دیتے "اتنا کہاں ہے جو سب کے لیے دودھ کا بندوبست کیا جائے۔ اگر مہمان بے وقت بھی پہنچ جاتے تھے تو اسی وقت ان کے لیے کھانا تیار ہوتا تھا اور کبھی مہمانوں کی کثرت سے اکتاتے اور گھبراتے نہ تھے بلکہ کبھی کوئی واقف دوسری جگہ ٹھہر جاتا تھا تو گرانی ہوتی تھی اور ناگواری کا اظہار ہوتا تھا اور کوئی ناواقف بلکہ مخالف بھی دسترخوان پر شریک طعام ہو جاتا تھا تو اس کے ساتھ بھی پوری بشاشت کا اظہار ہوتا تھا اور ہر طرح اعزاز و اکرام کیا جاتا تھا۔

یہ فیاضی اور مہمان نوازی بھی حضرت مدنیؒ کی خاندانی خصوصیات میں شامل تھی، حضرت مدنیؒ کے بڑے بھائی حضرت مولانا سید احمدؒ تو فیاضی و مہمان نوازی میں حد سے بڑھے ہوئے تھے۔ مہمانوں کے لیے ہر قسم کا تکلف کرتے تھے اور قسم قسم کے کھانے تیار کراتے اور خود ہمیشہ معمولی سادہ غذا کھاتے تھے حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ہمراہی میں اپنے دوسرے سفر حج کے موقع پر کئی ہفتے میں حضرت مولانا سید احمدؒ کا مہمان رہا ہمارے لیے روزانہ قسم قسم کے کھانے دسترخوان پر آتے تھے اور خود حضرت مولانا سید احمدؒ کے لیے بے گھی کے پتلے شوربے میں بھیگی ہوئی باسی روٹی یا اُبلی ہوئی موٹی قسم کی سویاں یا موٹے چاول، اور عذر یہ کہ میرا معدہ خراب ہے اچھی غذا ہضم نہیں ہوتی۔

حضرت مدنیؒ کے چند اوصاف اور بعض واقعات نمونے کے طور پر لکھ دیے گئے ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ تخلقوا باخلاق اللہ کی صحیح تصویر اور اوصافِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا مکمل نمونہ تھے اور پوری طرح آپ کے رگ و ریشہ میں اللہ اور رسول کی عظمت و محبت سمائی ہوئی تھی۔ اور قادر مطلق نے آپ کو تمام انسانی

کمالات سے آراستہ بنا رکھا تھا۔ ایسی مقدس ہستیاں خال خال وجود میں آتی ہیں اور بنی نوعِ انسان کی ہدایت اور رہنمائی کے فرائض انجام دیتی ہیں۔

مقبولیت بارگاہ الٰہی:

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ کسی بندے کو محبوب بناتے ہیں تو حضرت جبرئیل علیہ السلام کو آواز دیتے ہیں کہ اللہ عزّوجل فلاں شخص کو محبوب رکھتا ہے تم بھی اس سے محبت رکھو، پس حضرت جبرئیل علیہ السلام اس سے محبت رکھتے ہیں پھر حضرت جبرئیلؑ آسمان میں منادی کرتے ہیں کہ اللہ عزّوجل فلاں شخص کو محبوب رکھتا ہے تم بھی اس سے محبت رکھو، پس آسمان والے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں اور روئے زمین پر اس کی مقبولیت عام کر دی جاتی ہے (بخاری شریف)

روئے زمین پر جو عام مقبولیت اور محبوبیت اور شہرت وقعت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو حاصل ہوئی وہ شاذونادر ہی کسی اللہ کے بندے کو نصیب ہوتی ہے جس طرف بھی پہنچ جاتے تھے ہر واقف وناواقف آشنا بیگانہ آپ کا گرویدہ اور شیدائی نظر آتا تھا۔ اس کا قدرے اندازہ اس عالم گیر ماتم سے لگایا جا سکتا ہے جو حضرت کے وصال کے بعد ہند اور بیرون ہند میں کیا گیا۔

مسلمان ہی نہیں بلکہ جو غیر مسلم بھی آپ سے ملتا تھا وہ آپ کا نیازمند اور عقیدت مند بن جاتا تھا جس کی تائید وتوثیق بخوبی ان بیانات اور مضامین سے ہوتی ہے جو حضرت مدنیؒ کے متعلق غیر مسلموں کی جانب سے شائع ہوئے اور برابر شائع ہوتے رہتے ہیں۔

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے المرءُ مَعَ مَن اَحَبَّ (آدمی انھیں کا ساتھی ہے جن سے محبت کرتا ہے) حضرت مدنی قدس سرہٗ کو اپنے اسلاف اور بزرگوں کے ساتھ فرطِ تعلق اور شیفتگی آپ کی لامحدود ترقی کا اصلی راز تھی سب بزرگوں کے ساتھ قلب کی وابستگی تھی اور سب کی خوبو لیے ہوئے تھی۔

حضرت مدنیؒ اپنی ہر تحریر میں اپنے نام کے ساتھ ننگ اسلاف ضرور تحریر فرماتے تھے، جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلاف کی پوری زندگی ہر وقت آپ کے سامنے رہتی تھی اور آپ اسی کے موافق زندگی بسر فرماتے تھے۔ جو شخص اسلاف کا بہترین نمونہ اور اصلی کارنامہ تھا وہ ہمیشہ اپنے کو ننگ اسلاف ہی گردانتا رہا یہ جاں نثاری کی آخری حد ہے۔

(۳) بعض حدیثوں میں اللہ کے مقبول بندوں کی یہ نشانی بتائی گئی ہے کہ انہیں دیکھ کر اور ان کے پاس بیٹھ کر خدا یاد آتا ہے۔

حضرت مدنیؒ کے پاس بیٹھ کر بیٹھنے والوں کی جو کیفیت و حالت ہوتی تھی اس کو بیٹھنے والے خود ہی اچھی طرح جان سکتے ہیں۔ مجھے ایک مرتبہ ایک غیر مسلم نے یہ کہا کہ ان کو دیکھ کر پرماتما یاد آ جاتا ہے۔

حضرت مدنیؒ کے چند اہم کارنامے:

درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اور انسان کی شخصیت اس کے اعلیٰ کارناموں سے ظاہر ہوتی ہے اور پہچانی جاتی ہے حضرت مدنیؒ کی زندگی کا ہر ورق ان کا ایک مستقل کارنامہ ہے جس کی تفصیل کے لیے بڑا دفتر درکار ہے اس لیے چند نمایاں کارنامے اختصار کے ساتھ ذکر کیے جاتے ہیں۔

۱۔ جدوجہد آزادی:

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے اخلاف نے برطانیہ کے روز افزوں اقتدار اور استبداد اور مسلمانوں کے روز بروز تنزل و انحطاط سے متاثر ہو کر برطانوی استبداد سے خلاصی اور مسلمانوں کی فلاح و ترقی کے لیے ایک اہم تحریک جاری کی تھی جو چند امور پر مشتمل تھی۔

(۱) ہر ممکن طریقے سے برطانوی اقتدار کے خاتمے کی کوشش کرنا اور غلامی سے آزادی حاصل کرنا اور بیرونی استبداد کا خاتمہ کرنا۔

(۲) ناواقف مسلمانوں کو اسلام کی تعلیمات کا واقف کار رہبر و کار بنانا۔

(۳) ایسے علمی مراکز قائم کرنا جن میں اسلامی تعلیم و تربیت ہو اور اسلامی مجاہد اور اسلام کو پھیلانے والے رضا کار پیدا ہوں۔

(۴) اسلام سے ناواقف لوگوں کو اسلام سے باخبر بنانا اور اسلامی تعلیمات کو اس انداز کے ساتھ پیش کرنا کہ طبیعتیں جلد قبول کر لیں۔ اس آخری مقصد کے لیے حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے اخلاف نے متعدد رسالے بھی تحریر فرمائے جن میں عجیب و غریب انداز سے خوش اسلوبی کے ساتھ اسلام کو پیش کیا اور تمام اسلوبی تعلیمات کو عقلی طور پر ضروری اور مفید ثابت کیا تاکہ مسلمان اسلام کو سمجھ کر دوسروں میں پھیلائیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے بیٹوں کے بعد ان کے شاگردوں اور مریدوں اور تعلق رکھنے والوں نے ان مقاصد کی تکمیل کے لیے جان توڑ کوشش کی اور ہر نوع کی قربانی دی پھر ولی اللّٰہی سلسلے کے تمام بزرگوں نے ان مقاصد کو اپنایا لیکن ہر ایک نے اس مقصد میں زیادہ محنت وجانفشانی کی جو اس کو زیادہ اہم نظر آیا اسی سلسلے کی ایک کڑی حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔

حضرت مدنیؒ کی سیاسی زندگی اور جدوجہد آزادی کا اس وقت آغاز ہوتا ہے جب آپ ۱۹۲۰ء میں مالٹا کی اسیری سے رہائی کے بعد شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ کے ہمراہ ہندوستان تشریف لائے اس وقت ہندوستان میں تحریک خلافت زوروں پر تھی آپ بھی سرگرمی کے ساتھ اس میں شریک ہو گئے اگرچہ شروع سے آپ حضرت شیخ الہندؒ کے شریک کار تھے اور ہر خفیہ تحریک کے معین و مددگار تھے مگر یہ خفیہ کاروائیاں منظر عام پر اسی وقت آئیں جب آپ مالٹا کی رہائی کے بعد ہر طرح سیاسی میدان میں کود پڑے اور پوری سرگرمی اور گرم جوشی کے ساتھ ہر اس تحریک میں حصہ لیا جو برطانیہ کے خلاف جاری تھی پھر جب جولائی ۱۹۲۱ء میں آل انڈیا خلافت کانفرنس (کراچی) منعقد ہوئی تو آپ نے اس کانفرنس میں ایک اہم تجویز پیش کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ

"موجودہ حالات میں مسلمانوں کے لیے سرکاری فوج میں ملازم رہنا یا بھرتی ہونا یا دوسروں کو بھرتی کی ترغیب دینا حرام ہے اور ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ یہ بات فوجی مسلمانوں کے ذہن نشین کر دے"

اس کی پاداش میں حضرت مدنیؒ اور رئیس الاحرار مولانا محمد علی اور دوسرے حضرات کی گرفتاری عمل میں آئی اور خالق دینا ہال کراچی میں مقدمہ کی سماعت ہوئی حضرت مدنیؒ کا جب بیان ہوا تو آپ نے بے خوف و خطر صاف طور پر کہہ دیا کہ

"اگر مذہبی فرائض کا لحاظ و احترام نہ کیا گیا تو اس صورت میں کروڑوں مسلمان کو اس مسئلے کا تصفیہ کر لینا چاہیے کہ آیا وہ مسلمانوں کی حیثیت سے زندہ رہنے کو تیار ہیں یا حکومت برطانیہ کی رعایا کی حیثیت سے؟ اگر گورنمنٹ مذہبی آزادی چھیننے کے لیے تیار ہے تو مسلمان اپنی جان تک قربان کر دینے کو تیار ہوں گے اور میں پہلا شخص ہوں گا جو اپنی جان قربان کروں گا۔"

آخری الفاظ پر بے ساختہ مولانا محمد علی مرحوم نے حضرت مدنیؒ کے قدم چوم لیے جو گویا کہ اس بات کی شہادت تھی کہ "میں پہلا شخص ہوں گا جو اپنی جان قربان کروں گا"
غرض اس مقدمے میں سب ماخوذین کو دو دو سال قید سخت کی سزا ہوئی۔
حضرت مدنیؒ نے دو سال قید کی سختیاں بھگتنے کے بعد اپنی سیاسی سرگرمیوں کو اور زیادہ بڑھا دیا۔ آپ کے مخلص ہمدردوں کی خواہش تھی کہ دو سال کی سخت سزا کے بعد کچھ آرام فرمائیں، کچھ اپنے رویے میں نرمی پیدا کریں، ایک مرتبہ ایسی ہی گفتگو ہو رہی تھی۔ حضرت مدنیؒ نے جواب دیا میں نے ایک ڈاکو کو دیکھا جو پچیس سال سے جیل میں ہے کچھ دنوں کے لیے باہر جاتا ہے پھر آجاتا ہے جب ڈاکوؤں میں یہ ہمت ہے تو ہماری ہمت تو اس سے بہت بلند ہونی چاہیے۔ اور ہر وقت جدوجہد آزادی میں منہمک رہنے لگے۔ چنانچہ جب دارالعلوم دیوبند کی صدر مدرسی پر آپ کو مجبور کیا گیا تو آپ نے اس کو ان شرائط کے ساتھ قبول کیا

(۱) سیاسی خدمات پر کوئی پابندی نہ ہوگی۔
(۲) دارالعلوم کی جانب سے سیاسی امور میں کوئی مخل نہ ہوگا۔
(۳) ہر مہینہ میں ایک ہفتہ کی رخصت ہوگی۔
(۴) ایک ہفتہ سے زائد اگر رخصت لی گئی تو اس پر تنخواہ وضع کی جائے گی۔

دارالعلوم کی صدارت کے بعد پھر اسی نظام سے سیاسی جدوجہد جاری رہی حضرت مدنیؒ کا جمعہ ہمیشہ سیاسی کام کے لیے باہر گزرتا تھا اور طویل سفروں کے لیے مزید رخصت بھی لی جاتی تھی اور ہندوستان کے طول عرض میں چپے چپے اور گوشے گوشے میں بیداری پیدا کی اور برطانوی ظلم و استبداد سے خلاصی اور حصول آزادی کا عام جذبہ پیدا کر دیا اور اس مقصد کے لیے اس قدر سفر کیے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ سال کا قریب قریب نصف حصہ سفر ہی میں گزرتا تھا اور حصول آزادی کے لیے وہ قربانیاں دیں جو کوئی دوسرا نہیں دے سکتا۔ حضرت مدنیؒ کی تقریر میں ایک خاص بات یہ تھی کہ واقعات اور خود برطانوی تحریرات سے حکومت برطانیہ کی مخالفت ہوتی تھی۔ محض الفاظ کی بارش نہ ہوتی تھی اس لیے آپ کی تقریر حکومت برطانیہ کے خلاف ایک زبردست تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی تھی اور سامعین کے قلوب میں راسخ ہو جاتی تھی اس لیے حکومت برطانیہ آپ کو "بڑا خطرناک آدمی" سمجھتی تھی اور آپ کی روک تھام کے لیے ہر وقت تدابیر کرتی رہتی تھی مگر آپ

کسی حال میں بھی رُکنے اور جھکنے والے نہ تھے اور کسی زبردست سے زبردست طاقت سے ڈرنے والے نہ تھے۔

انجام کار برطانیہ کو اپنا بوریا بستر اٹھانا پڑا اور ہندوستان کو اس بیرونی استبداد سے خلاصی ملی اور آزادی حاصل ہوئی۔

حضرت مدنیؒ کی یہ ساری جدوجہد حضرت شاہ ولی اللہؒ والی تحریک کے مقصد اوّل کے لیے جس کی آپ کے ہاتھوں تکمیل ہوئی پھر یہ آپ کا کمالِ سیادت اور کمالِ طریقت تھا کہ آپ نے اس سیاسی پلیٹ فارم سے بھی مسجد و خانقاہ کا کام لیا اور انہی سیاسی سرگرمیوں کے ذریعے لوگوں کو "راہِ سلوک" طے کرایا اور بہت سے بندگانِ خدا کو عارف باللہ اور ولیِ کامل بنا دیا اور اسی سیاسی پلیٹ فارم سے سیکڑوں غیر مسلموں کو اسلامی تعلیمات اور اسلامی اخلاق و کردار سے باخبر اور واقف بنا دیا۔

اس مقصد کی تکمیل اور حصولِ آزادی کے بعد آپ ہمہ تن پوری سرگرمی اور گرم جوشی کے ساتھ دیگر مقاصد کی تکمیل کی طرف متوجہ ہو گئے۔

اگرچہ سیاسی سرگرمیوں کے دوران میں بھی آپ ان دیگر مقاصد میں برابر کوشش کرتے رہے جیساکہ آگے معلوم ہوگا مگر حصولِ آزادی کے بعد تو صرف وہی مقاصد اصلی مقاصد زندگی بن گئے تھے اور کوئی دوسرا مقصد و مشغلہ سامنے نہ تھا۔

۲۔ فیضانِ علم:

حضرت مدنیؒ نے علم حدیث حضرت مولانا رشید احمد محدث گنگوہیؒ سے حاصل کیا اور آخر تک اسی کے درس و تدریس میں مشغول رہے شروع میں آپ نے مدینہ منورہ میں ایک مدرسہ میں ملازمت کی پھر اس سے گھبرا کر مسجد نبوی کو اپنی درس گاہ بنایا اور لوجہ اللہ درس حدیث جاری کیا اور متواتر دس سال تک مسجد نبوی میں درس دیتے رہے جس میں مدینہ منورہ کے لوگوں کے علاوہ مصر، شام، یمن، فلسطین، تیونس، ایران وغیرہ ممالک کے طالبین علم نبوی بھی شریک ہوتے تھے اور سیکڑوں طالب علموں نے اس عرصے میں آپ سے علم حدیث حاصل کیا۔

حضرت مولانا محمد الیاسؒ اکثر فرمایا کرتے تھے "اس شخص کی گرد کو دوسرا کس طرح پہنچ سکتا ہے؟ جس نے سالہا سال مسجد نبوی میں بیٹھ کر درس حدیث دیا ہو"

حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے جب ۱۳۴۶ھ میں دارالعلوم دیوبند کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا تو حضرت مدنیؒ سے درخواست کی گئی کہ وہ دارالعلوم کی صدارت قبول فرمالیں اور اس وقت دارالعلوم کے سابقہ اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے اس کے سوا چارہ کار بھی نہ تھا اس لیے آپ نے اپنے اسلاف کی اس علمی یادگار کو انحطاط سے بچانے کی غرض سے سیاسی اُلجھنوں کے باوجود چند شرائط کے ساتھ دارالعلوم کی صدارت کو قبول فرمالیا تاکہ سیاسی کام بھی جاری رہے اور دارالعلوم کا اقتدار بھی برقرار رہے اور پھر آخر تک روزانہ ۷-۸ گھنٹہ دارالعلوم میں حدیث شریف کا درس دیتے رہے اور تقریباً ۲۸ سال یہ فیضان علم جاری رہا۔

دارالعلوم میں دورۂ حدیث پڑھنے والوں کی تعداد عموماً دو سو[۱] سے متجاوز ہوتی ہے[۱] تو گویا اس دیوبند کے قیام میں پانچ ہزار سے زائد ہند اور بیرون ہند کے طالب علموں نے

---

[۱] تاریخ دارالعلوم کے دور جدید میں تو یہ تعداد پانچ سو سے متجاوز ہو چکی ہے اور دارالعلوم روز افزوں ترقی پر ہے۔ دیوبند کے گذشتہ سفر (۹، ۱۰ راگست ۱۹۸۹ء) میں نے دیکھا کہ حضرت شیخ الاسلام کے خلف ارشد مولانا سید ارشد مدنی ترمذی شریف کا درس دے رہے تھے۔ طلبہ کی کثرت سے ایک عام جلسے کا، نظم و آداب سے طلبہ کی ایک جماعت کا اور بیان سے درسِ حدیث و سنت کا اندازہ ہوا۔ تمام طلبہ تک صاحبِ درس کی آواز پہنچانے کے لیے لاوڈ اسپیکر کا انتظام تھا۔ محسوس ہوتا تھا کہ مدرس حدیث کی آواز کانوں ہی سے نہیں ٹکراتی بلکہ دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔

اگر آج حضرت شیخ الاسلام کے اخلاف کے بیان و درس حدیث میں ایک گنہ گار قلب یہ کیفیت محسوس کرتا ہے تو خود حضرت علیہ الرحمہ کے درسِ حدیث کی کیفیات کا عالم کیا ہوگا؟ اس کا واقعی اندازہ تو کوئی قلب سلیم و مزکی ہی کر سکتا ہے، لیکن ان کیفیات و تجلیات کا کچھ نہ کچھ اندازہ تو ایک عامی او گنہ گار بھی کر ہی سکتا ہے۔

موجودہ دور میں دارالعلوم کی یہ ترقی اور طلبا دین و شیفتگان علوم حدیث و دلدادگان سنت نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیمات کا یہ رجوعِ عام عنداللہ اس کی مقبولیت کی دلیل نہیں تو اور کیا ہے؟ (ابوسلمان شاہجہانپوری)

آپ سے علم حدیث حاصل کیا جن میں سے اکثر و بیشتر دینِ اسلام کو سکھانے اور پھیلانے میں مشغول و معروف ہیں اور سیکڑوں مدرسے اور خانقاہیں اور مسجدیں آباد ہیں حضرتؒ کا "یہ فیضانِ علم" قیامت تک جاری رہے گا جو حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تحریک کے دیگر مقاصد میں جدوجہد کا ثمرہ ہے۔

فیضانِ عمل:

دینِ اسلام کو ہر وہ شخص پڑھا اور سکھا سکتا ہے جو عالمِ دین ہو اور اسلام سے واقف ہو مگر دین کے موافق عملی زندگی کو بنانا اور شریعت کا تبع کر کے اسلامی نمونہ قائم کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں یہ اس عالمِ حقّانی اور امامِ ربّانی کا کام ہے جو جہد و ریاضت اور اللہ والوں کے فیضِ صحبت سے خود شریعت کا پابند اور خوگر بن چکا ہو اور اللہ و رسولؐ کی محبت و عظمت سے بھرپور ہو، اسی کا نام "طریقت اور معرفت" ہے۔

حضرت مدنیؒ نے جہد و ریاضت اور بزرگوں کے فیضِ صحبت سے جو عملی جذبات اور باطنی کمالات حاصل کیے تھے ہمیشہ پوری محنت و جاں فشانی کے ساتھ وہ دوسروں کی طرف منتقل کرتے رہے اور سیکڑوں بندگانِ خدا کو "راہِ سلوک" طے کرا کر "شیخ طریقت" بنا دیا جو بذاتِ خود آج دوسروں کی ہدایت و رہنمائی کا کام انجام دے رہے ہیں۔ حضرت مدنیؒ کا یہ عملی فیضان بھی انشاء اللہ قیامت تک جاری رہے گا۔

حضرت مدنیؒ نے اپنی سیاسی سرگرمیوں کے دوران میں بھی فیوضِ باطنی کے پہنچانے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی اور سیاسی سرگرمیوں کے ختم کر دینے کے بعد تو ہمہ تن اسی میں مشغول ہو گئے تھے اور "درسِ معرفت" کا سلسلہ عام اور وسیع ہو گیا تھا چنانچہ چند ہی سالوں میں ہزاروں کی باطنی تربیت ہوئی اور سیکڑوں کو خلافت عطا ہوئی۔

حضرت مدنیؒ سے جو لوگ واقف ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ برطانوی جبر و استبداد سے خلاصی اور حصولِ آزادی کے بعد حضرت مدنی کی سیاسی سرگرمیاں ایک گونہ ہو گئی تھیں، نہ سیاسی جلسوں میں تشریف لے جاتے تھے، نہ سیاسی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے اور نہ سیاسی امور میں کوئی خاص دل چسپی لیتے تھے اور ظاہری انہماک و اشتغال پہلے سے بھی بڑھ گیا تھا سفروں کی کثرت پہلے سے زیادہ ہو گئی تھی اور دُور دُور کے طویل سفر شروع ہو گئے تھے اور قرب و جوار کے بھی اسفار بڑھ گئے تھے یہ سارا انہماک و اشتغال اور محنت و جانفشانی

اور سرگرمی وگرم جوشی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی تحریک کے دیگر مقاصد کی تکمیل کے لیے تھی جو حضرتؒ کا نصب العین اور اصلی مقصد تھا۔

حضرت مدنیؒ جنھوں نے آج سے ۷۲ سال پہلے ۱۹۲۱ء میں خالق دینا ہال کراچی میں یہ نعرۂ حق بلند کیا تھا کہ

"اگر مذہبی فرائض کا لحاظ و احترام نہ کیا گیا تو اس صورت میں کروڑوں مسلمانوں کو اس مسئلے کا تصفیہ کرلینا چاہیے کہ آیا وہ مسلمانوں کی حیثیت سے زندہ رہنے کو تیار ہیں یا حکومت برطانیہ کی رعایا کی حیثیت سے؟ اگر گورنمنٹ مذہبی آزادی چھیننے پر آمادہ ہے تو مسلمان اپنی جان تک قربان کردینے کے لیے تیار ہوں گے اور میں پہلا شخص ہوں گا جو اپنی جان قربان کروں گا"

آج بھی ان حضرت مدنیؒ کی دل کی آواز یہی تھی صرف لفظ حکومت برطانیہ بدلا ہوا تھا اور موجودہ حکومت کو خطاب و عتاب تھا۔

حضرت مدنیؒ کا یہ اسلامی جذبہ فنا اور معدوم نہیں ہوا تھا بلکہ وہی جذبات اندرون میں موجزن تھے جو اسلام کے معاند اور مخالف حکومت کے لیے ہوسکتے ہیں اور اس کے لیے آپ اپنی جان تک قربان کردینے کو تیار تھے البتہ اس قدر فرق ضرور ہے کہ اب چوں کہ جمہوری حکومت ہے اس لیے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اکثریت کو پہلے اسلام سے باخبر کریں تاکہ یہ اسلام دشمنی اور عناد دور ہو اور حالات اعتدال پر آئیں یہی اس وقت آئینی تدبیر ہے اور یہی تحریک ولی اللہی کے آخری مقصد کا مفہوم ہے اور یہی وہ درس انسانیت ہے جس کو حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے پورے زور و شور اور سرگرمی کے ساتھ شروع فرمایا جو اسلام کی سربلندی اور ترقی کا واحد طریق ہے۔

حضرت مدنی کی اصلی یادگار:

انبیاء اور رسولوں کی یادگار مجلسِ میلاد پڑھ دینے اور برسی منا دینے سے نہیں ہوتی ان کی یادگار کے لیے ضروری ہے کہ ان کی لائی ہوئی شریعت اور بتائی ہوئی تعلیمات کو زندہ اور برقرار رکھا جائے اور اپنی زندگی کا دستور العمل اور نصب العین بنایا جائے اسی طرح انبیاء و رسولوں کے حقیقی وارثوں اور جانشینوں کی یادگار محض خصوصی نمبروں کے شائع کردینے سے قائم نہیں ہوتی بلکہ ان کی اصل یادگار یہ ہے کہ ان کے کارناموں کو زندہ اور

برقرار رکھا جائے اور ان کے مقاصدِ زندگی کو فروغ وعروج دیا جائے پس حضرت مدنیؒ کی یادگار کے لیے بھی محض "شیخ الاسلام نمبر" اور "مدنی نمبر" شائع کردینا کسی طرح بھی کافی نہیں ہوسکتا بلکہ اصلی یادگار یہ ہے کہ حضرت مدنیؒ کے کارناموں کو زندہ رکھا جائے اور ان کے مقاصد زندگی کو عروج وفروغ دیا جائے اور ان مقاصد کے لیے قربانی دی جائے جن پر انھوں نے اپنی جانِ عزیز قربان کی۔

(روزنامہ الجمعیۃ، دہلی، ۱۷رتا ۳۱ر مارچ ۱۹۵۸ء)

شیخ الاسلام اور اتباعِ سنّت

مولانا محمد انعام اللہ شاہجہان پوری

تمہید:

وجود شے پر سرور و انبساط اور اس کے عدم پر حزن و ملال انسانی سرشت کا مقتضیٰ ہے لیکن بعض اشیا کا عدم حسی حقیقت میں وہ عدم نہیں بلکہ ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جسے وجود سرمدی حاصل ہو جاتا ہے۔ بشری وجود بھی اسی کی ایک کڑی ہے جس کا منتہا حیاتِ جاودانی ہے اور اسی کے پیش نظر رحلت انسانی پر تسکین حاصل ہو جاتی ہے۔

تخلیق انسانی کا مقصد:

تخلیقِ انسانی کا مقصد عبودیت رُب ہے اور عبودیت سے واقفیت پر مبنی ہے۔ جو سید الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہو سکتا ہے آپ کے دامن سے وابستگی، تشنہ کامانِ حقیقت کے لیے راہِ ہدایت اور جویانِ طریقت کے لیے صراط مستقیم، من جدّ وجد۔

شیخ الاسلام کے متعلق:

شیخ الاسلام حضرت مولانا مدنی نور اللہ مرقدہٗ آفتاب رشد و ہدایت کا وہ مظہر ہیں جن کی تجلیات ربانی کی ضوافگن شعاعوں نے چہار دانگ عالم کو جگمگا دیا، گم گشتگان راہِ شریعت و طریقت کو واصل بحق کیا اور جویانِ طریقِ عبودیت کو راہ یاب فرمایا، حقائق کی نقاب کشائی کی اور ظلماتِ متراکمہ کے پردوں کو چاک کر دیا۔ احیائے سُنّت نبوی اور امحاء بدعت آپ

لہ مولانا کفایت اللہؒ صدر مدرس مدرسہ عربیہ سعیدیہ۔ شاہجہان پور کے نامور صاحبزادے اور دیوبند کے فاضل۔

کا شعار اور عمل بالسنتہ آپ کی حیات کا مرقع، معمولاتِ مختلفہ کا تجزیہ ہر فعل و عمل پر آپ کے عامل بالسنتہ ہونے کا شاہد ہے۔

معمولاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ گل دستۂ رُشد و ہدایت جو عموماً بے اعتنائی کا شکار ہو رہا ہے اس چمن میں پھلا اور پھولا۔ آپ نے قول و فعل سے ثابت کر دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نشان زدہ طریق پر عمل کرنے میں اِنسانی فلاح و بہبود مضمر ہے۔

صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تعظیم و تکریم اور سلفِ صالحین کی عظمت و وقعت اور ان کے اقوال و افعال کی پیروی میں کامیابیِ دارین منحصر ہے۔ ذیل میں حضرت کے اقوال و افعال پیش کیے جاتے ہیں جن سے حضرت کی زندگی کا من وجہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

عام حالات:

آج کل جب کہ عام طریقہ پر سنت کو اختیار کرنا تو درکنار فرائض اور واجبات کی کماحقہا ادائیگی خال خال رہ گئی ہے اور جہاں ہے بھی تو وہ محدود، شریعت کا بتمامہا ملحوظ نظر رہنا، خواہ وہ حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد پھر یہ کہ عبادات کے قبیل سے ہوں یا معاملات کے بہت شاذ و نادر ہے۔

ایسے حالات میں حضرت کا عمل اور اس پر استقامت ہر شخص کو عموماً اور منتسبین کو خصوصاً اپنے اعمال پر محاسبہ اور شریعت پر ثابت رہنے کی دعوت دیتے ہیں اُب آیئے غور کریں کہ حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے کس طرح رہبری فرمائی:

حالت تنعل:

دایاں پَیر جوتے میں اول داخل کیا کرتے تھے اور نکالتے وقت بایاں پَیر جوتے سے نکلا کرتے تھے۔ مسجد میں داخل ہونے کے وقت روایات مختلفہ کی تطبیق اس طرح ہوتی ہے کہ پہلے بایاں پیر جوتے سے نکال کر باہر رکھا اور پھر دایاں نکال کر مسجد میں رکھا اور مسجد سے خارج ہونے کے وقت بایاں پَیر نکال کر باہر رکھا اور پھر دایاں نکال کر جوتے میں داخل کیا ہے۔

یہ وہ سُنّت ہے جس کو عام طریقے پر معمولی شمار کیا جاتا ہے۔۔۔

ترجمہ۔ جس نے کسی سُنّت کو رواج دیا اس کے واسطے اس کا ثواب ہے اور اس پر عمل

کرنے والوں کا ثواب (مزید) ہے۔ بلاشبہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے لیے ثواب پر ثواب ہے۔ اور اس پر زیادتی متیقن ہے۔ حدیث بھی سُن لیجیے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے۔۔۔۔۔

ترجمہ۔ فرمایا تم میں سے کوئی جب جوتا پہنے تو دائیں سے ابتداء کرے اور جب نکالے تو بائیں سے دایاں پہنے جانے میں اوّل ہو اور نکالے جانے میں آخر ہو۔ (شمائل) حضرت مولانا نوراللہ مرقدہٗ کے ہر فعل سے سُنّت کی رُونمائی ہوتی ہے۔

حالت صعود بر زینہ:

زینہ پر جانے کے وقت دائیں پَیر کو سبقت کی سعادت حاصل ہوتی اور واپس نزول کے وقت بایاں پَیر نیچے کے ہر زینہ پر واقع ہوتا۔ یہاں بھی اتباعِ سُنّت پورے طریقے پر جلوہ گر نظر آتی ہے۔ بہت کم ہیں وہ لوگ جن کے قلوب میں اتباعِ سُنّت کا یہ ولولہ موجود ہو۔

حالاتِ نشست:

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی نشست کے عموماً تین حالات رہے ہیں۔ حالتِ تشہد۔ حالتِ تورک اور تکیہ پر دائیں جانب سہارا لینے کی حالت۔ عرض کیا جا چکا ہے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا ہر فعل سُنّت کی طرف راہبری کرتا ہے اور یہ آپ کی عملی تعلیم ہے جو کما حقہٗ پوری ہو چکی اس پر عمل کرنے یا نہ کرنے کا تعلق دوسروں پر ہے اب ہر ایک حالت پر غور فرمایئے۔

۱۔ حالتِ تشہد طعام کے وقت تھی جس میں کسی وقت بائیں ہاتھ پر ضرورت کی وجہ سے سہارا لیا ہے۔ مہمانوں کے سامنے اپنے ہاتھ سے کھانا پیش فرماتے۔ اور فرماتے کھایئے کھایئے۔ کسی مہمان کے بعید ہونے کی وجہ سے ہاتھ پر سہارا لے کر کھانا آگے پہنچاتے۔

۲۔ حالتِ تورک تدریس کے وقت تھی اس میں بھی دو حال رہے ہیں اکثر و بیشتر تو دائیں سُرین پر سہارا لیا جاتا رہا اور اگر تعب لاحق ہوا تو بائیں سُرین پر بھی سہارا لیا ہے مگر یہ کم ہے۔

۳۔ دیگر اوقات میں تکیہ پر دائیں جانب سہارا لے کر نشست فرما رہے ہیں یہ حال نشست گاہ میں گفت و شنید کے موقع پر رہی ہے۔

محبوبیت تیمن:

حالتِ مذکورۂ بالا کے پیش نظر یہ چیز واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت کو تیمن محبوب تھا یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ آپ کے عمل سے روایات کی تطبیق بھی معلوم ہو جاتی ہے وہ روایت بھی سُن لیجیے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوبیت تیمن ذکر کی گئی ہے۔ حضرت عائشہ رضؓ سے روایت ہے۔۔۔۔

ترجمہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقدور بھر تیمن اختیار کرنا پسند فرماتے تھے، پاکی حاصل کرنے میں، جوتا پہننے میں اور کنگھا کرنے میں اور (راوی نے شہر) واسط میں اس سے پہلے کہا تھا یہ صورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام حالتوں میں تھی۔ (بخاری)

خیال فرمایئے! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حالات میں تیمن پسند فرماتے تھے۔ اور حضرت مولانا کے حالات پر نظر ڈالنے سے بھی تیمن کی محبوبیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اعمال کے سوال کا ترتب نیت پر مزور ہے تاہم مجموعی حالات کے اعتبار سے موافقت یا عدم موافقت بالسنہ کا اندازہ لگانا آسان ہے لہذا اتباع سنت کے جذبے کو تسلیم کیا جائے گا۔

حالت تثاؤت:

اور سنیے! بہ وقت تدریس اگر بتقاضائے بشریت کبھی تثاؤب (جمائی) پیدا ہوتا تو اکثر و بیشتر کظم فرماتے (بہ تکلف مُنھ بند کرنا) دیکھا گیا ہے اور احیاناً مُنھ پر ہاتھ بھی رکھ لیا ہے۔

حضرت مولانا مدنی نور اللہ مرقدہٗ کا معمول رہا ہے کہ مجلس میں تشریف آوری کے وقت، اسی طرح دوسرے مواقع پر بھی کسی کو تعظیماً کھڑے ہو جانے کی مجال نہیں تھی اگر کسی سے ناواقفیت کی بنا پر قیام پایا گیا اور حضرت مولانا نے دیکھ لیا تو آپ اسی جگہ کھڑے ہو جاتے تاوقتیکہ وہ بیٹھ نہ جائے آپ آگے روانہ نہیں ہوتے۔

تعظیماً قیام سے متعلق واقعہ:

بعد العشاء بخاری شریف کی تدریس کے لیے دار الحدیث میں تشریف فرما ہوئے قیام تعظیم کا تذکرہ شروع ہو گیا طلبہ ثبوت پر دلائل پیش کرتے رہے اور مقصد یہ تھا کہ حضرت اپنی آمد کے وقت کھڑے ہونے کی اجازت دے دیں حضرت خندہ پیشانی کے ساتھ ہر ایک کا

جواب دیتے رہے حتیٰ کہ مسکراتے ہوئے فرمایا، اچھا میں پانی پی لوں پھر آپ کو جواب دوں گا۔ یہ سلسلہ تقریباً پندرہ منٹ تک جاری رہا اور آخر کار طلبہ نے سکوت اختیار کر لیا آج کل تعلیماً گمراہ نہ ہوتے پر چیں بہ چیں ہونا اور مستحق ملامت قرار دینا ایک عام بات ہے، مگر حضرت مولانا کے یہاں اس کا برخلاف ہوتا۔ یہ ہے اتباعِ سُنّت نبوی کہ اصرار کے باوجود قیام کی اجازت نہیں دی جاتی ہے۔

یہاں جواز و عدم جواز کی تحقیق بحث سے خارج ہے اب آپ کے تکلم اور تخاطب کے متعلق بھی سُن لیجیے اور اصل بات تو یہ ہے کہ کہاں تک بیان کیا جائے اور کیا بیان کیا جائے اور کون سی بات نظر انداز کی جائے ہر فعل مستقل ایک باب ہے جس کا بیان کرنا دشوار گذار منزل ہے ؎

نہ حسنے غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں

پھر آخر کس طرح بیان کیا جائے

صفتِ کلام:

آپ کا خطاب بہت واضح اور شستہ ہوتا تھا، بلید الذہن یا ذکی الفوا و سب ہی مستفید ہو سکتے تھے۔ جُملوں کی ترتیب اور تعلق کی ہمہ گیری کے باوجود ہر جُملہ منفصل اور علیحدہ علیحدہ ادا کیا جاتا تھا۔ سُرعت اور جلد بازی آپ کے کلام سے وراء الوراء تھی، تدریس، تلقین، تقریر اور تخاطب ہر ایک میں یہی حال رہا۔

ایک واقعہ:

اثنائے تدریس میں ایک مرتبہ استطراداً فرمایا، میں یہ سُرعتِ تامہ تقریر کر سکتا ہوں مگر یہ توقف فی الکلام کوشش کے بعد حاصل کیا گیا ہے اور وجہ یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اسی طرح کلام کرنا نقل کیا گیا ہے (الفاظ راقم کے ہیں) یہ محض اتفاق ہے کہ حضرت مولانا کی زبان سے یہ کلمات نکل گئے ورنہ اربابِ نظر سے مخفی نہیں کہ آپ میں اخفا کس حد تک کارفرما تھا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

ترجمہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمھاری اس سبقت لِسانی جیسی، سبقت نہیں فرماتے تھے لیکن آپ واضح فاصل کلام فرمایا کرتے تھے آپ کا ہم نشین اس کو محفوظ کر لیتا تھا۔

(شمائل ترمذی)

حضرت مولانا کا عمل "طبق النعل بالنعل" کے مرادف ہے آپ کی طبیعت میں اتباعِ سُنّت کا ذوق رچ گیا تھا اور پھر کیوں نہ رچتا، شب و روز قال اللہ اور قال الرسول زبان پر جاری رہتا تھا اور فکرِ آخرت قلب پر مستولی رہتی تھی حضرت کے لباس اور اس کی وضع قطع کا مستقل باب ہے اس کے متعلق بھی کچھ گوش گذار کیا جانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

لباس:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لباس کی صفت میں ثوب خشن (کھردرا کپڑا) آیا ہے۔ حضرت شیخ الاسلام کا لباس ہر بصیر و خبیر اور موافق و مخالف پر ظاہر ہے آپ کے واسطے خاص طریقے پر تیار کرایا جاتا جس پر خشن ہونے کا اطلاق کما حقہٗ ہوتا تھا۔ یہ امرِ آخر ہے کہ استخلاصِ وطن کے پیش نظر اس خاص دیسی پارچہ کو مزید برآں اہمیت حاصل ہو گئی۔ اور یہ اہمیت نہ تو ثوب خشن کے سُنّت ہونے کو ختم کر دیتی ہے اور نہ اس پر ثواب کے مترتب ہونے میں کمی کو واجب کرتی ہے ہر دو چیز اپنے مقام پر ہیں پھر یہ کہ استخلاصِ وطن احکاماتِ شرعیہ کے پیش نظر رہا اس لیے اس اعتبار سے بھی اِنشاءاللہ ثواب کا مترتب ہوگا۔

سلف صالحین کا طرزِ عمل:

زیبِ تن کرتے کے ہر سہ عدد اسی دیسی پارچہ سے تیار شدہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"سفید لباس اختیار کرو اس لیے کہ وہ لطیف تر ہے اور عمدہ تر ہے اور اس میں اپنے مُردوں کو کفن دو۔"

جبہ و شیروانی:

حضرت نوراللہ مرقدہٗ کے استعمال میں شیروانی بھی رہی ہے اور جبہ بھی۔ علمائے عظام اور سلفِ صالحین کا یہی طرزِ عمل رہا ہے۔

مسحِ خُف:

دیوبند کے علاقے میں سردی غیر معمولی رہتی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خُف پر مسح منقول ہے۔ حضرت مولانا نے سُنّت کے ارادے سے ضرورت کی بنا پر سفر و حضر ہر دو حالت میں خُف پر مسح کیا ہے۔

مزاح:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مزاح کرنا بھی منقول ہے کتب احادیث میں مزاح کا باب مستقل قائم کیا گیا ہے۔ روایت ہے آپ نے مزاحاً فرمایا یا ذا الاذنین اے دو کان والے دوسری روایت ہے۔ یا ابا عمیر ما فعل النغیر اے ابو عمیر (بچے) نغیر (پرندہ) کیا ہوا۔ حضرت مولانا مناسب انداز میں مزاح فرمایا کرتے تھے۔

مزاح کا واقعہ:

خوب یاد ہے! دارالحدیث میں تقسیم کتب انعامیہ کا جلسہ ہوا حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہ کے ہاتھ سے انعام حاصل کرنے کی سعادت ہر طالب علم کے قلب میں موجزن رہتی تھی اور پورے سال انتظار کرنے کے بعد یہ موقع دستیاب ہوتا تھا۔

حضرت نے راقم الحروف کا نام لیا، شعبۂ تعلیمات نے جس حسن و خوبی کے ساتھ انتظام کر رکھا تھا اس کے مطابق طلبہ کے درمیان سے گزر ہوا اور حالت یہ تھی کہ میری تھی منقش ٹوپی سر پر تھی حضرت نے تنکر فرمانے کے بعد مسکراتے ہوئے خاص انداز میں فرمایا۔ "آپ تو خود انعام ہیں آپ کو انعام کی کیا ضرورت" حاضرین جلسہ پر مزاح کی وجہ سے مسکراہٹ طاری ہو گئی اور پھر حسبِ دستور تمام کتب ممتحنہ کے حاصل کردہ نمبرات اور کتبِ انعامیہ کے اسماء ذکر کرنے کے بعد کتابیں سپرد فرمائیں۔

دف:

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کے ورع کے متعلق بھی کچھ عرض کیا جائے۔ درس میں دف (خاص باجا) بجانے کے متعلق روایت آئی تو حضرت مولانا نے فرمایا کہ یہ جو بجایا گیا ہے بجانے کی باقاعدہ تعلیم نہیں پائی تھی اور آج کل تو باقاعدہ سیکھتے سکھاتے ہیں جس کا مطلب یہ تھا کہ اچھا یہ ہے کہ آج کل شادی وغیرہ خوشی کے موقع پر بجایا نہ جائے۔

اللہ اللہ یہ ہے شانِ کمال ورع جو تقویٰ سے فائق ہے منہیات سے اجتناب کو تقویٰ کہا جاتا ہے اور شبہات سے اجتناب کو ورع کہا جاتا ہے۔

ایک نادر مثال:

آپ برگِ تنبول کا شوق فرمایا کرتے تھے اس میں تمباکو بھی ہوتا تھا درس میں برسبیل تذکرہ فرمایا تمباکو میں نہیں کھاتا تھا اتفاقاً کھانے لگا۔

یہ تو حضرت نے فرمایا اَب عمل پر ذرا غور فرمایئے۔ مکان سے تدریس کے لیے روانگی کے وقت شوق فرمایا کرتے تھے اور دارالحدیث کے زینے پر قدم رکھنے سے پہلے یا آخری بالائی زینہ پر گرا دیا جاتا تھا، اثنائے تدریس شوق فرماتے کبھی نہیں دیکھا۔

صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کی تعظیم وتکریم:

صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تعظیم وتکریم اور ان کے مناقب ودرجات کا لحاظ حضرت مولانا کے رگ ریشہ میں پیوست معلوم ہوتا تھا، جس کا اندازہ اس سے بآسانی لگایا جاسکتا ہے کہ کتب دورۂ حدیث میں احادیث کی اسانید کے ختم پر متن شروع ہوتے سے پہلے حضرت مولانا کے درس میں رواۃ پر ترضی (رضی اللہ عنہم کہنا) ضروری ہوتا تھا جن کی تقطیع، بریدیں سلفِ صالحین کے طرزِ عمل کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے سلفِ صالحین سے محبت رکھنا اور ان کے طرزِ عمل کو خاص اہمیت دینا ایک بے بہا دولت ہے جو قدر شناسوں کے ہاتھ لگتی ہے اور وہی اس کے ثمرہائے رنگا رنگ سے مستفید ہوتے ہیں۔

کرتا:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گریبان کے متعلق احادیث مرویہ کے پیش نظر آپ کا گریبان مزدورو مفتوح (بند، کھلا) ہر دو طریقے پر رہا ہے۔ یہ ہے احادیث مرویہ کی عملی تشریح۔

عمامہ:

بزمانہ موجودہ اہلِ عرب کے معمول کے مطابق آپ ایامِ شتا میں سر سے رومال لپیٹا کرتے تھے لیکن زمانہ بعد میں عمامہ کو اختیار فرمایا لیا جو آخر تک معمول رہا۔

عمامہ سے متعلق ایک واقعہ:

برسبیل تذکرہ جواباً آپ نے فرمایا کہ سنت تو عمامہ ہے چونکہ میری گردن میں درد کی تکلیف رہتی ہے اور رومال سے کافی حفاظت ہو جاتی ہے اس لیے رومال باندھتا ہوں یہاں حضرت نے اپنا عذر اور عمامہ کے سنت ہونے کو بیان فرمایا۔ آخر میں خود حضرت

نے سفر و حضر ہر دو حالت میں عمامہ کو اختیار فرمایا ہے دگر یہ ہمیشہ نہیں رہا۔ آخر میں پھر رومال ہی اختیار فرمالیا تھا۔)

باقیات الصالحات:

آج کل کہا جاتا ہے کہ یہ حضرت "باقیات الصالحات" میں سے ہیں جس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ ان کے طریقے پر چلنے کی ضرورت نہیں۔ افسوس! اس کے علاوہ اور کیا کہا جائے کہ یہ کلام ترکِ سنّت کی دعوت دینے کے مرادف ہے اور بس۔ عمامہ کے متعلق روایت ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

جعفر بن عمرو بن حریث اپنے والد سے روایت کرتے ہیں قال رایت علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر میں نے رسول اللہ عمامۃ سوداء (شمائل) سیاہ عمامہ دیکھا ہے۔ سمجھ رہا ہوں کہ کلام دراز ہوتا جارہا ہے اور ممکن ہے کہ آپ کو بھی کلفت ہو رہی ہو مگر کیا کیا جائے حضرت رحمتہ اللہ علیہ کا ہر پہلو ایک تابناک باب رکھتا ہے جس کا بیان نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے۔

سفید لباس:

لباس کے متعلق معتد بہ کلام ہو چکا مگر ابھی کلام باقی ہے اور وہ یہ ہے کہ ان تمام خوبیوں کے ساتھ حضرت مولانا کا لباس سفید رہا ہے اور یہ علیحدہ ایک سنّت ہے۔
(شمائل ترمذی)

تعلیمی سال کے اختتام پر جس میں کتبِ احادیث کا باقی ماندہ حصہ روایۃً ختم کیا جاتا ہے ایک صاحب نے اثنائے قراءتِ احادیث رواۃ پر ترضی کو ترک کر دیا۔ حضرت مولانا احادیث کی بذات خود قراءت کے وقت بھی ترضی کا خاص لحاظ فرماتے تھے۔

بزرگوں سے عقیدت:

حضرت مولانا مدنی نور اللہ مرقدہٗ کو سلف صالحین، ائمہ مجتہدین اور سلاسل اربعہ کے بزرگوں سے خاص عقیدت تھی اور ان حضرات کے احترام کو ضروری قرار دیتے تھے جس کا اندازہ حضرت کے اس مکتوب سے ہو سکتا ہے جو مولانا محمود صاحب گنگوہی کے جواب میں تحریر کیا گیا ہے اور اس کی اشاعت رسالہ دارالعلوم میں ہوئی ہے، افسوس یہ ہے کہ فی الحال رسالہ موجود نہ ہونے کے سبب سے مکتوب بعینہٖ نقل نہیں کیا جاسکا۔

مکتوب:

خیال ایسا ہو رہا ہے کہ حضرت مولانا محمود صاحب گنگوہی نے سلاسل اربعہ کے بزرگوں میں سے کسی ایک کی ترجیح کا استفسار فرمایا تھا اور یہ بھی معلوم کیا تھا کہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہٗ نے آپ کو کس سلسلہ میں بیعت کیا ہے:

جواب:

حضرت مولانا مدنی نور اللہ مرقدہٗ نے جواب تحریر فرمایا جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کام میں لگے رہیے کسی کی ترجیح سے کیا مطلب اور حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہٗ العزیز نے مجھے تو چاروں سلسلوں میں بیعت فرمایا ہے تاکہ کسی ایک کی راجحیت سے دوسرے کی مرجوحیت کا تصور ہی نہ ہو۔ سبحان اللہ کیا پاکیزہ خیالات ہیں۔ بس اسی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت مولانا کے دل میں ان حضرات کی عقیدت کس درجے پیوست تھی۔

خاتمہ:

غرضیکہ حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کا ہر فعل وعمل اتباعِ سنّت کا شاہکار ہے جس سے مولانا کا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ محبت وتعلق اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم سے عقیدت وتعظیم اور سلف صالحین کا احترام واضح ہوجاتا ہے اور یہی وہ امور ہیں جن کی بنا پر دارین کی فلاح وبہبود حاصل ہوتی ہے۔

اب جب کہ حضرت کا سایہ ہم پر باقی نہ رہا لیکن حضرت کے نشان زدہ راستے موجود ہیں۔ جو ہم کو منزل پر پہنچا سکتے ہیں۔ نزاکت وقت وحالت کے پیش نظر ہمیں بہت جلد قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔

(روزنامہ الجمعیۃ دہلی ۱۰ر فروری ۱۹۵۸ء)

امام الاولیا حضرت مدنی کی شان کا

ایک اجمالی نقشہ

مولانا محمد سعید احمد

نحمدہٗ ونصلی علی رسولہ الکریم

ترجمہ۔ "اور بڑھاتا جاتا ہے اللہ سوجھنے والوں کو سوجھ اور باقی رہنے والی نیکیاں بہتر رکھتی ہیں تیرے رب کے یہاں بدلہ اور بہتر پھر جانے کی جگہ (یعنی دنیا کی رونق رب کے یہاں کام کی نہیں) نیکیاں سب رہیں گی اور دنیا نہ رہے گی، آخرت میں ہر نیکی کا بدلہ بہترین اور انجام ملے گا۔" (پارہ ۱۶ رکوع ۸)

شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہٗ نے ملک و قوم پر اتنے احسان کیے ہیں کہ سرزمینِ وطن ان کی شکرگذاری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔ آپ کا شمار صفِ اوّل کے ان قائدین میں ہوتا تھا جن کے طفیل برطانیہ جیسی جابر و قاہر طاقت کے پنجۂ آہنی کی گرفت سے ملک آزاد ہوا۔ ایک عظیم المرتبت پیشوائے دین کی حیثیت سے آپ نے مسلمانوں میں آزادی کی روح پھونکی، ان کے دل و دماغ پر اسلام کی حقیقی تعلیم کی اسپرٹ پہنچانے کی زبردست کوشش کی اور مذہب کی اجتماعی تعلیمات کو مجاہدانہ شان کے ساتھ اجاگر کیا۔ آپ کے سینے میں ایک ایسا دل تھا جو مخلوق خدا کی خدمت کے لیے تو ریشم سے زیادہ نرم رہتا تھا لیکن حق و باطل کے معرکے میں فولاد سے بھی زیادہ سخت ہو جاتا تھا:

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

حضرت مولانا کی شخصیت نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے ایشیا کے لیے موجب صد افتخار

بانی مدرسہ عربیہ رحیمیہ تعلیم القرآن، ڈوڈگہ بونگہ (پاکستان)

تھی۔ حضرت شیخ الاسلام کی مساعی کا مرکز ملک کی آزادی، ایشیا کی آزادی، استعمار کے پنجۂ استبداد سے تمام اسلامی ممالک کی آزادی اور آخرکار انسانیت کی آزادی تھی۔ یہ نظریہ ان کا عقیدہ تھا جو انھیں وراثت میں اپنے شیوخ سے ہاتھ آیا تھا اور وہ اس پر یقین رکھتے تھے کہ مغرب کی ان مادی طاقتوں کی برقراری کی صورت میں اخلاقی قوتیں اور انسانیت کی اصلی قدریں کبھی نہیں اُبھر سکتیں اس لیے حضرت مدنیؒ کی کانگرس میں شمولیت اور سیاسی جلسوں میں شرکت سے عام طور پر ایک سیاسی سرگرمی خیال کیا جانا ٹھیک نہیں۔ اگر حقیقت پر غور کیا جائے تو یہ محض سیاسی سرگرمی نہ تھی بلکہ عشقِ خداوندی کا مظاہرہ تھا اور جہادِ فی سبیل اللہ کا کارنامہ۔ آپ نے وادیٔ عشق میں قدم جمانے کے بعد نگاہ اٹھا کر دیکھا تو انسانیت اور خدا کا اصل باغی برطانیہ کو پایا، جو پوری فرعونیت اور شیطنت پر اترا ہوا تھا اور ہر طرح سے مخلوقِ خدا کو جادۂ حق سے بھٹکاتا تھا۔ پھر کیا تھا، اس کی نفرت و عداوت حرزِ قلب میں اتر گئی اور اس دشمنِ حق کی پامالی پر اتر آئے۔ برطانیہ سے یہ نفرت و عداوت محض اس لیے نہ تھی کہ وہ سفید فام غیر ملکی قوم ہے۔ اس کا اصل منبع یہ تھا کہ انسانیت کی راہ میں سب سے بڑا سنگین پتھر برطانوی استعمار ہے جو کسی طرح مخلوقِ خدا کا خدا کی راہ پر چلنا گوارہ نہ کرتی۔ پس آپ نے ضروری سمجھا کہ اس آہنی دیوار کو جس طرح بھی ممکن ہو توڑ دیا جائے اور انسانیت کی راہ کو ہموار اور کشادہ کیا جائے۔ آپ نے پورے ستائیس۲۷ سال ہر اس طریق سے برطانیہ کے خلاف جہاد کیا، جو ممکن نظر آیا کانگرس کی اسٹیج آپ کی دوربین نگاہوں میں محض ایک جلسہ گاہ نہ تھی بلکہ برطانیہ کے خلاف محاذِ جنگ کا ایک زبردست مورچہ تھا، جس پر جم کر وہ دشمنِ حق و انسانیت پر دار پر وار کر رہے تھے اور شکست پر شکست دے رہے تھے بالآخر فتحِ کامل نصیب ہوئی۔ بالآخر برطانوی اقتدار کا خاتمہ ہو گیا، یہ آہنی دیوار پاش پاش ہو گئی، اور ایک بڑا مقصد پورا ہو گیا تو حضرت مدنی کی وہ ساری سیاسی سرگرمیاں ختم ہو گئیں اب نہ سیاسی جلسوں کی شرکت رہی اور نہ حکومت د وزارت کے کاموں سے کوئی خاص دلچسپی باقی رہی۔

اس دور میں وہ کام تیزی کے ساتھ شروع کر دیا گیا جس کے لیے اس آہنی دیوار کو توڑا گیا تھا اور برطانوی اقتدار کو ختم کیا گیا تھا۔ اب آپ نے پوری سرگرمی کے ساتھ انسانیت کا درس شروع فرمایا اور مسلمانوں کی تعلیم و تربیت اور ان کی ہدایت پر توجہ فرمائی۔ جاننے والے بخوبی جانتے ہیں کہ وہی حضرت مدنیؒ جن کی کوئی مذہبی تقریر بھی سیاست اور برطانوی مخالفت سے خالی نہ ہوتی تھی، حصولِ آزادی کے بعد ان کی زبان مبارک سیاست سے بالکل ناآشنا ہو گئی اور وعظ و تقریر

کا لبِّ لباب اور اصل خلاصہ صرف دو لفظ ہوتے تھے علم اور ذکر یعنی معرفت خداوندی اور یہ وہ اہم امور ہیں. جن پر ساری انسانیت منحصر اور موقوف ہے اور اسی پر اخلاق کی اصلاح و تہذیب اور رشد و ہدایت کا تمام تر دار و مدار ہے جس کو بتانے اور سمجھانے کے لیے انبیا اور رسولوں کو بھیجا گیا اور انسانیت کی راہ بتائی گئی حضرت مدنیؒ نے یہ درسِ انسانیت جس انہماک اور سرگرمی کے ساتھ شروع فرمایا اس کے مقابلے میں تمام سیاسی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں - بڑھاپے اور ضعف کے باوجود دور دور کے سفر اور ہزاروں لاکھوں ناواقفوں کو درسِ معرفت دیتے اسفار میں ملنے والے بالکل مہلت نہ دیتے' دیوبند کے قیام میں اسباق کی مشغولی رہتی، کئی کئی سو طالب علم درس میں شامل ہوتے، ان میں سے نصف بھی اگر ایک ایک سوال کرتے تو بہت وقت صرف ہو جاتا کیوں کہ آپ ہر ایک کو تسلی بخش جواب دیتے - ڈاک دیکھنے کی بھی بہت کم مہلت ملتی. پانچ پانچ چھ چھ سو خطوط کا انبار لگا رہتا تھا.

دراصل حضرت مولانا ممدوح کی زندگی کے تین دور ہیں.

پہلا دور خالص علمی خدمت کا دور تھا جو ابتدائے قیام مدینہ منورہ ۱۳۱۶ھ سے شروع ہو کر اسارتِ مالٹا ۱۳۳۴ھ پر ختم ہو جاتا ہے. اس سترہ سال کی مدت میں تین بار آپ ہندوستان تشریف لائے، کبھی چند مہینے اور کبھی چند برس رہ کر پھر حجاز چلے گئے فتراتِ قیامِ ہند کے استثنا کے بعد کم و بیش اٹھارہ ۱۸ سال آپ نے مدینۂ منورہ میں علم دین کی نشر و اشاعت میں صرف فرماتے اسی دور کی یادگار آپ کا فاضلانہ رسالہ الشہاب الثاقب ہے جس میں بریلوی فتنہ کی بیخ کنی کی ہے اور اسی دور کی یادگار ہماری جماعت کے ممتاز عالم، ادیبِ ہند مولانا عبدالحق مدنیؒ تھے جنھوں نے مدینہ طیبہ میں مولانا موصوف سے تعلیم پائی تھی.

دوسرا دور مالٹا سے واپسی ۱۳۳۸ھ کے بعد سے ۱۳۴۶ھ دارالعلوم دیوبند کے صدارتِ عظمیٰ پر فائز ہونے کا ہے یہ زمانہ آپ کی سیاسی گرم جوشی تحریکِ خلافت و تحریکِ آزادی کی علم برداری فرنگی حکومت سے ٹکر لینے اور اس کے نتیجے میں قید و بند کا دور ہے جس میں آپ کی سیاسی بصیرت و تدبر، مجاہدانہ عزم و ہمت اور غیر متزلزل صبر و استقامت کا ظہور ہوا.

تیسرا دور دارالعلوم دیوبند کی صدارت ۱۳۴۶ھ سے لے کر وفات تک کا زمانہ ہے جس میں بہ یک وقت آپ دنیائے اسلام میں اپنی نوع کی واحد اور سب سے بڑی دینی درس گاہ کے شیخ الحدیث اور صدر المدرسین بھی تھے اور اس مدت کے اکثر حصہ میں ملک اور مسلمانانِ ہند کی فلاح و

بہبود کی کفیل جماعت جمعیت علمائے ہند کے صدر ورئیس بھی تھے اور ان تمام تعلیمی، سیاسی و اصلاحی عظیم مہمات کی انجام دہی کے ساتھ اس دور میں ہندوستان کے سب سے اونچے عارف باللہ اور شیخ طریقت بھی تھے۔

سبحان اللہ! جس دریا کا ایک پیالہ بھی ضبط کرنا مشکل ہے حضرت مدنیؒ اس کے سات سمندر چڑھائے ہوئے تھے پھر بھی ضبط موجود ہے کیا مجال ہے کہ ساغر چھلک جائے ان کے ہاتھوں پر لاکھوں بندگان خدا نے بیعت کر کے ہدایت پائی اور کتنوں کو معرفت خداوندی نصیب ہوئی پچھلے سفروں میں ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو ہزار کا ایک مجلس میں بیعت ہونا تو معمولی بات تھی بلکہ ایک جگہ پر بانس کنڈی (آسام) میں چھ ہزار آدمیوں نے بیعت کا شرف حاصل کیا کثیر مجمع میں آواز نہ پہنچنے کی وجہ سے بیعت کرتے وقت لاؤڈ اسپیکر استعمال کیا گیا تھا۔

۱۹۴۷ء کے فسادات میں آپ بارہا لوگوں کو فرمایا کرتے تھے کہ ہمت و استقلال کے ساتھ ہندوستان میں جمے رہو دیکھو مدینہ منورہ میں میرے ذاتی مکانات بھی ہیں اور بھائی بھتیجے بھی ہیں مجھے ہندوستان میں رہنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں پھر بھی میں نے طے کر لیا ہے کہ ہندوستان نہیں چھوڑوں گا اس لیے کہ جو خدمت مخلوقِ خدا کی یہاں رہ کر کر سکتا ہوں وہ مدینہ منورہ میں نہیں ہو سکتی اور فرماتے تھے کہ میں نے ہندوستان میں مرنے کا فیصلہ کر لیا ہے سبحان اللہ پھر وہ فیصلہ پورا کر کے دکھلا دیا ہندوستان میں ہندوستانیوں کے لیے مٹے اور بالآخر سب کو داغ مفارقت دے کر سرزمین ہند ہی کی آغوش میں جا سوئے۔ ایسی مقدس ہستیوں کا جینا اور مرنا، سونا اور جاگنا، ہنسنا اور بولنا سب رضاءِ الٰہی کے لیے دوسروں کی خاطر ہوتا ہے اپنی ذاتی حیثیت اور منفعت معدوم ہوتی ہے۔

جب عشق خداوندی سینے میں ہر طرح سما جاتا ہے، تو مخلوق خدا کے دردِ عام کی ہی خواہی اور خیر خواہی اور ہر ایک کی ہمدردی اور خدمت گذاری کا عارضہ لاحق ہو جاتا ہے، جو ہر مدح و ذم سے مستغنی اور بے نیاز کر دیتا ہے حضرت مدنیؒ کی زبان پر یہ مصرع کئی بار آتا تھا ؎

عاشق بدنام کو پروائے ننگ و نام کیا

حضرت شیخ الاسلام ایشیا کی سب سے بڑی جامع دارالعلوم دیوبند کے شیخ اکبر، جمعیت علمائے ہند کے صدر، جماعت دیوبند کے عظیم رہنما اور جماعت دیوبند کی سو سالہ تحریک کی اس صدی میں آخری کڑی تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد دیوبند کے قیام سے جس تعلیمی، دینی و روحانی اور اجتماعی تحریک کا آغاز ہوا تھا، اس کے کئی انقلابوں اور دوروں کی تکمیل، مولانا مدنیؒ کی ذات پر

ہوکر اس ۱۹۵۷ء ہی پر اس کی انتہا ہوگئی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد اس کی ابتدائی کڑی حضرت مولانا نانوتویؒ کی ذات مبارک تھی جس سے اس دور کا آغاز ہوا تھا اور درمیانی کڑی حضرت شیخ الہندؒ تھے جنھوں نے اس کو شباب تک پہنچایا سا اور آخری کڑی حضرت شیخ الاسلام تھے جنھوں نے اسے انتہا کو پہنچایا۔ اس طرح ۱۸۵۷ء سے ۱۹۵۷ء تک سو برس کے عرصہ میں اس تحریک کا ایک دور مکمل ہوکر ختم ہوگیا۔

حضرت شیخ الاسلام نے آج کے لادینی اور مادی دور میں جن دینی واخلاق اور علمی اصول کا دائرہ خواص وعوام کے لیے وسیع کیا اور انسانیت کی جن قدروں کو اجاگر کیا دنیا ان پر ہمیشہ فخر کرے گی شیخ الاسلامؒ اسلامی علوم ومعارف اور ایشیائی فنون وادب کے علمبردار تھے اور آپ کی ہمت ظاہری وباطنی سے ملک کے باہر ہزاروں علما اس علمی امانت کے امین بن گئے جو اس مرکز علم وفن دارالعلوم دیوبند سے آپ کی بدولت نشر ہوتی رہی۔ آپ اپنے اساتذۂ کرام و شیوخ کے ابتدا ہی سے معتمد علیہ اور مرکز توجہ رہے اور بلا استثنا ان کے تمام اکابر وشیوخ انھیں اطمینان واعتماد اور اُمید بھری نگاہوں سے دیکھتے رہے تھے۔ آپ مختلف ماہرِ فن اساتذہ و شیوخ کی علمی وعملی یادگار تھے۔ قرآن مجید وحدیث فقہ وتفسیر وادب وخطابت منطق وفلسفہ کی مہارت وصداقت آپ کے قول وفعل سے نمایاں رہتی تھی آپ کی اس جامعیت نے علمی دنیا کو جو فائدہ پہنچایا اس پر صدیوں کام ہوتا رہے گا اور دنیا اُسے قدر کی نگاہوں سے دیکھتی رہے گی۔ اس لیے ان دینی سلسلوں کے ساتھ حضرت محترم ایک عظیم سیاسی رہنما اور زبردست انقلابی مجاہد بھی تھے، جنھوں نے عدم تشدد کے اصول پر ہندوستان میں انقلاب لانے کی سرگرمیوں میں قائدانہ حصہ لیا آپ اس سلسلے میں حجت الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کے تحریکی، سیاسی فلسفہ اور حکمت کے امین تھے اور اپنے استاد شیخ مولانا محمود حسن قدس سرہ کے مجاہدانہ جوش عمل کے علمبردار تھے۔ آپ کو پوری قوم نے جانشینِ شیخ الہند تسلیم کیا۔ آپ کا نظریۂ علم یہ تھا کہ علم کا نتیجہ رہبانیت نہیں ہے بلکہ علم کو سیاست کے میدان میں رہنما ہونا چاہیے۔ اس سے اسلام کا مذہب کی حیثیت سے اور مسلمانوں کا ملت کی حیثیت سے وقار قائم رہ سکتا ہے۔ نیز یہ کہ ہندوستانی مسلمان اپنی ملی حیثیت کے تحفظ کے ساتھ ہندوستانی قومیت کا ایک اہم عنصر ہیں۔ اس مرکب نظریے کے ساتھ ملک کی آزادی انھیں ہر چیز سے بڑھ کر عزیز تھی جس کے لیے انھوں نے اپنی ہر محبوب چیز کی قربانیاں پیش کیں۔ یہ آزادی نہ صرف ملک کی آزادی کی حد تک انھیں عزیز تھی بلکہ اس لیے بھی کہ ہندوستان کی

آزادی کو وہ ایشیا اور ایشیا کی آزادی کو مشرق کی کتنی ہی پسماندہ اور کمزور ملکوں اور قوموں کی اسلامی ممالک کی آزادی کا پیش خیمہ جانتے تھے جس میں داخل ہوئے بغیر ایشیا کے قصرِ آزادی میں داخلہ ممکن نہ تھا۔

چناں چہ ہندوستان کے آزاد ہو جانے پر ایشیا بلکہ مشرق کے کتنے ہی چھوٹے بڑے ملک یکے بعد دیگرے آزادی کی دولت سے مالا مال ہو گئے اور ہو رہے ہیں۔ سبحان اللہ! آپ ایک وقت اگر دنیا کے مادی پلیٹ فارم اور سیاسی اسٹیج کی جلوتوں میں نمایاں نظر آتے تھے تو دوسرے وقت ذکر اللہ کی خلوتوں میں، درس حدیث و قرآن کی مسندوں پر بھی جلوہ فرما رہتے تھے اور دونوں دائروں میں بھرپور قوت کے ساتھ رواں دواں تھے۔ ایک شعبے سے دوسرا شعبہ آپ کی توجہ کی جامعیت کو پراگندہ نہیں کر سکتا تھا۔ دینی زندگی کے ساتھ قومی زندگی اور اسلامی زندگی کے ساتھ بین الاقوامی زندگی اپنوں کی تربیت کے ساتھ دوسروں کی رعایت اور اپنوں کے احتساب کے ساتھ دوسروں کے لیے توسع ان کے کام کا نصب العین تھا اس لیے آپ نے درس تدریس باطنی تربیت اور روحانیت کے پاکیزہ مشاغل کے ساتھ قومی جدوجہد کا میدان بھی سر کیا اور عملاً ان اضداد کو جمع کر کے دکھلا دیا۔ اسی جامعیت کے اصول کو آپ نے ملک کے گوشے گوشے میں پھیلایا اور آپ کے ہزاروں شاگردوں نے، جو ہند و بیرون ہند میں پھیلے ہوئے ہیں، اس پر کام کیا اسی لیے آپ کی مقبولیت ملک کے ہر طبقے اور ہر قوم میں عام تھی حتیٰ کہ جن حضرات کو آپ سے اختلاف رائے بھی تھا۔ ان کے قلوب بھی حضرت ممدوح کی عظمت و عزت سے بھرپور تھے اور وہ آپ کے کمالات ظاہری و باطنی کے معترف رہے۔ حضرت ممدوح کا فیضان نہ صرف ہندوستان کے حدود تک محدود رہا، بلکہ عرب و عجم میں پھیلا اور آپ کے تلامذہ ایشیا کو چک سے لے کر یورپین ترکی تک پہنچے۔ ۱۹۱۷ء میں مالٹا کی اسارت سے لے کر ۱۹۴۲ء تک ہر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد حضرت کو قید و بند کے مصائب برداشت کرنے پڑے۔ قید و بند تو ہر طرح کی تکلیف و اذیت کا سبب ہے ہی لیکن حضرت نے تو اسلام، مسلمانوں اور آزادی ملک کی خاطر اور اس کے بعد جب ملک آزاد ہو چکا تھا۔ تو خود اپنوں ہی کے ہاتھوں جو اذیت اٹھائی وہ شاید ہندوستان میں کسی دوسرے کے حصے میں نہیں آئی۔ یہ اذیت بھی حضرت کے درجات کی مزید بلندی ہی کا سبب ہوئی۔ طائف میں تبلیغ حق کرتے ہوئے جس طرح کافروں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ڈھیلے، پتھر برسائے تھے اسی طرح ہندوستان میں انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کے اس سچے خادم پر ڈھیلے اور پتھر برسائے۔ تکلیف واذیت پہنچائی یہاں تک کہ جان لینے کی کوشش کی۔ حضرت تمام اذیتوں کو صبر و تحمل سے برداشت کرتے ہوئے تبلیغ حق میں مصروف رہے اور اپنی مخالفت کرنے والوں کے لیئے دعائے ہدایت فرماتے رہے۔ حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ نے فرمایا تھا کہ مولانا حسین احمد صاحب مدنی کی مخالفت کرنے والوں کے سوئے خاتمہ کا اندیشہ ہے جو لوگ حضرت شیخ الاسلامؒ سے عناد و مخالفت رکھتے ہیں وہ اب بھی توبہ کر کے اپنے حسن خاتمہ کی طرف توجہ کریں۔ سبحان اللہ! حضرت اپنے علم و فضل، زہد و ورع، اخلاص و تقویٰ، تواضع و انکسار، صبر و تحمل، مروّت سیر چشمی، فیاضی، جود و سخا، مہمان نوازی، بلندی اخلاق، امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور تواصی بالحق میں سنّت کے پیرو اور صحابۂ کرامؓ کے نمونے تھے۔

حضرتؒ جاڑے کی سرد راتوں میں کئی دفعہ اپنا لحاف تک مہمانوں کو دے دیا کرتے تھے اور خود عبا اوڑھ کر رات گزار دیتے جس کی خبر صبح کو لوگوں کو ہوتی اور اکثر تھکے ہوتے مہمانوں کو سونے کے بعد ان کی لاعلمی میں دباتے رہتے آپ کے دسترخوانوں پر کم از کم ساٹھ ستّر مہمان رہتے۔ کھانا کھلانے کے وقت کئی دفعہ اپنے مہمانوں کے ہاتھ بھی خود دُھلاتے۔ مولوی محمد قاسم صاحب نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ حضرتؒ لاہر پور تشریف لے گئے، گرمیوں کا زمانہ تھا، دو بجے دوپہر کو پہنچے اور کھانے کی فرمایش کی جیب میں نے حضرت کا ناشتہ دان گھر میں لیجانے کے لیے اٹھایا تو وہ بھرا ہوا تھا۔ مولوی صاحب نے عرض کیا کہ حضرت ناشتہ تو موجود تھا پھر کھانا نوش کیوں نہیں فرمایا جواب دیا "لکھنؤ سے یہاں تک کوئی مسلمان قلی بھی تو نہیں ملا جس کے ساتھ کھاتا تنہا کھانے کو جی نہیں چاہا"۔ سبحان اللہ!

ان کے قریب رہ کر ان کی زندگی کے شب و روز کا جائزہ لینے والے انھیں قرون خیر کی یادوں کا زندہ جاوید مجسمہ سمجھنے پر مجبور تھے۔ لکھا ہے کہ مدینہ پہنچ کر حرم پاک کی جالیوں کے سامنے اپنے نانا صلی اللہ علیہ وسلّم کی باتوں کو عوام کے گوش گزار کرنے میں جب کئی برس بیٹھے رہے تو اس دَور کے دینداروں نے یہ بھی دیکھا کہ مسجد نبوی میں درس حدیث کی ساعتیں محبوب و محب کے وصال کامل کے نظارہ پیش کرتی تھیں اور بسا اوقات جالیوں کا ہر حجاب یوں اٹھ جاتا تھا گویا کوئی پردہ درمیان میں حائل ہی نہیں ہے اسی زمانے کا واقعہ ہے کہ آپ کے تلامذہ میں سے ایک صاحب کو حیات النبیؐ کے متعلق شکوک تھے، دورانِ درس میں انھوں نے ایک بار نظر اٹھا کر دیکھا تو سامنے

نہ قبۂ خضرا تھا اور نہ جالیاں، بلکہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود تشریف فرما تھے۔ انھوں نے کہنا چاہا اور ساتھ والے طلبہ کو متوجہ کرنا چاہا تو حضرت مدنیؒ نے اشارہ سے منع فرمایا۔ سبحان اللہ اس طالب علم کو مشاہدہ کرا کے مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام شکوک کو حل کرا دیا۔

اللہ اللہ! یہ تھا حضرت شیخ الاسلامؒ کا بارگاہ نبوت سے تعلق جب کبھی حضرتؒ نے قبۂ خضرا پر صلوٰۃ وسلام پڑھا تو اندر سے صاف آواز آئی وعلیکم السلام یا وَلَدِی۔ سبحان اللہ! یہ حالات حضرت کو بارہا پیش آئے اور روحانی طور پر ہی نہیں بلکہ مادی نگاہیں بھی ان حالات کو بارہا ملاحظہ کرتیں۔ عام طور پر آپ عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر کافی دیر بعد مواجہہ شریف میں حاضری دیا کرتے (مواجہہ شریف میں جب کہ آپ بیدار ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت اس طرح ہوتی ہے کہ آپ میں اور ذات اقدس سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم میں کوئی حجاب کسی قسم کا نہیں ہے۔

بارگاہ رسالت میں حضرت شیخ کی یہ حاضری بھی عجیب پرکیف ہوا کرتی تھی حضرت شیخ نے حاضری کا یہ وقت غالباً اس لیے منتخب فرمایا تھا کہ زائرین کا ہجوم قدرے کم ہوتا تھا۔ اس وقت حضرت شیخ کی خواہش یہ ہوا کرتی تھی کہ اپنے وعلیکم السلام یا وَلَدِی فرمانے والے جدِ بزرگوار صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تنہائی میں حال دل پیش کریں پھر بھی بعض وابستگان اس بے تابانہ حاضری کے پرسعادت لمحات میں معیت کا شرف دور و قریب رہ کر حاصل کر ہی لیا کرتے تھے۔ دارالعلوم دیوبند میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بارہا اگلی صفوں سے تشریف لاتے ہوئے دیکھا۔ ایک دفعہ فالج گرا تو رات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور ہاتھ پھیر کر فرمایا میں آپ کی بیمار پرسی کے لیے آیا ہوں۔ صبح حضرت شیخ بالکل تندرست اُٹھے۔ ایک دفعہ حضور علیہ السلام کی زیارت ہوئی تو قدموں میں گر گئے آپ نے ارشاد فرمایا کہ کیا مانگتے ہو عرض کی جو کتابیں پڑھ چکا ہوں وہ یاد ہو جائیں اور جو نہیں پڑھی ہیں ان کے متعلق اتنی قوت ہو جائے کہ مطالعے میں نکال سکوں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ آپ کو دیا۔ اس معلوم ہوا کہ حضرت شیخ کا حافظہ عطیۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

اس محبت کی وجہ سے سنت کی شیدائیت اپنے کمال کو پہنچی ہوئی تھی کہ جن اُمور کو ادنیٰ تعلق بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا ان پر عمل کرتے تھے دُنیا کو حیرت ہو گی کہ دارالعلوم دیوبند کے

چمن میں کیکر کا درخت لگوایا لوگوں کو خیال تھا کہ اس درخت سے کیا فائدہ ! نہ اس میں پھول ہے نہ پھل، نہ اس سے خوشبو نہ خوش نمائی، نہ یہ زینتِ چمن ! پھر کیوں لگوایا تحقیق سے پتا چلا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیکر کے درخت کے نیچے بیٹھ کر صحابہؓ سے بیعت لی تھی جو بیعت رضوان کے نام سے زبان زد خاص و عام ہوئی یہ درخت اس کی یادگار ہے۔ سبحان اللہ ! حضرت شیخ سرتاپا متبع سنت تھے آپ کی کوئی نقل و حرکت خلافِ سنت نہیں ہوتی تھی جو لوگ آپ کو سب سے زیادہ قریب سے دیکھنے والے ہیں وہ اس کے شاہد ہیں ؎

محال است سعدی کہ راہِ صفا
تواں رفت جز آں پے مصطفےٰ

ولایت کا ہی وہ مقام ہے جو سب سے زیادہ رفیع ہے۔ اسی لیے خدا پاک نے جو مقبولیت حضرت کو بخشی تھی وہ تاریخ میں بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ آپ کی محبوب و مقبول شخصیت صحیح معنی میں شمع کی مثال تھی جس پر جوق در جوق پروانے نثار تھے اور ہر ایک شوقِ جانبازی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں لگا رہتا تھا مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ نہ صرف سفر بلکہ حضر میں بھی کوئی وقت ایسا نہیں دیکھا گیا کہ ایک کثیر مجمع شوقِ دید میں آپ کے ارد گرد موجود نہ ہو۔ البتہ جب آپ بسترِ استراحت پر تشریف لے جاتے تو مشتاقانِ زیارت کا یہ ہجوم بڑی حسرتوں کے ساتھ مجبوراً وہاں سے منتشر ہوتا۔ لیکن دوسرے وقت میں باہر تشریف لے جانے سے پہلے دولت کدے پر پروانوں کا اجتماع پھر شروع ہو جاتا۔ یہی نوعیت سفر میں ہوتی چناں چہ ان پچھلے سفروں میں ۱۲ ہزار آدمیوں نے ایک جگہ پر آپ کا استقبال کیا۔ سبحان اللہ ! درویشی اور ولایت اسی کا نام ہے۔ ہم اُسے درویش اور ولی نہیں مان سکتے جو اجتماعی ذمہ داریوں سے بھاگتا ہو، جو ملک پر قبضہ جمائے ہوئے استعمار و استبداد کے خلاف کشمکش کرنے سے گریز کرتا ہو۔ جو عوام کی خدمت کے کاموں کو دنیا داری کہتا ہو، تمدن و سیاست کے ہنگاموں سے گھبراتا ہو۔

جب یہ بات صاف ہوگئی کہ ولایت یہ ہے کہ اللہ اللہ بھی ہو اور عوام کی خدمت بھی ہو خدا کی محبت بھی اور بندگانِ خدا کا درد بھی آخرت کا فکر بھی ہو اور ملک و قوم کی بھلائی کا خیال بھی تو آیئے اس معیار پر مدنی درویش کو پرکھیں۔

یہ موجودہ دور کے اس درویش کامل کی شان ہے کہ عبادت و ریاضت میں وہ جنید و شبلی ہے، علم و فضل میں وہ بخاری و رازی ہے اور اصلاح و تجدید کے کاموں میں وہ عمر ابن عبدالعزیز کی مثال ہے

وہ جنیدِ دورِ حاضر وہ طریقت کا امام
وہ زمانہ کا غزالی فخرِ رازی نیک نام

سبحان اللہ! جہاں توجہ الی الحق کی وجہ سے عبادت اور ریاضت کرتے تھے، شب بیداری میں خدا کو یاد کرتے تھے اور ذکر الٰہی کے لیے خلوتوں کا سکون تلاش کرتے تھے، وہاں وہ خلق خدا پر بھی کامل نظرِ شفقت رکھتے تھے اور انسانوں کے دکھ درد میں ان کے کام آتے تھے غرض کہ مخلوق خدا کے لیے بڑے ہی خیر خواہ تھے۔ عام طور پر تہجد کی نماز کے بعد عوام کے لیے دعا فرماتے اور گریہ وزاری کرتے تھے۔

سبحان اللہ! حضرت مدنیؒ نے اپنے آپ کو عوام کے لیے بالکل قربان کر رکھا تھا آج کل اُستاد صاحبان مختصر سفر طے کر کے آتے ہیں تو تکان ہو جاتا ہے سب سے پہلے آرام کی فکر کرتے ہیں؛ مگر حضرتؒ سفر طویل سے اگر عین درس کے وقت تشریف لاتے تو اسی وقت سبق پڑھاتے آرام کا تصور تک نہ تھا ایک دن طلبہ کے کثرت سے سوال کرنے پر کسی نے کہا کہ آپ لوگ حضرت کے آرام کا خیال کیجیے تو فرمایا کیا دنیا میں آرام کے لیے پیدا ہوا ہوں ۱۲ بجے دن کے وقت لو چل رہی ہے زمین جھلس رہی ہے آسمان آگ برسا رہا ہے مگر حضرت ذوق وشوق کے عالم میں دارالحدیث سے سبق پڑھا کر واپس تشریف لے جاتے ہیں چھتری پیش کی جاتی ہے تو منظور نہیں ہوتی بارش کے زمانے میں راستہ کیچڑ آلود ہے، ترشح ہو رہا ہے، مگر حضرتؒ دارالحدیث کی طرف جا رہے ہیں کپڑوں پر کیچڑ پڑ رہا ہے اس کی جانب توجہ ہی نہیں، ایک ہاتھ میں چھڑی دوسرے میں چھتری، کس کی ہمت ہے کہ بڑھ کر چھتری پکڑ سکے سواری بھی قبول نہیں فرماتے۔ ناصر تانگہ والا تانگہ لیے کھڑا ہے۔ طلبہ گزارش کر رہے ہیں کہ حضرت راستہ کیچڑ آلود ہے پیدل چلنا مناسب نہیں، تانگہ سے تشریف لے چلیں حضرت نے فرمایا کہ دیکھو کیچڑ سے ہم پیدا ہوئے ہیں اور اسی میں جائیں گے تو ڈر کیا ہے!

ایک دفعہ سول سرجن نے بڑی سختی سے منع کیا کہ رات کو درس نہ دیا جائے حضرت نے سول سرجن کا مشورہ قبول فرما لیا مگر اس طرح کہ بجائے رات کے عصر کی نماز کے بعد درس کا سلسلہ شروع فرما دیا طلبہ نے بھی بہت اصرار کیا کہ حضرت کچھ دنوں کے لیے سبق موقوف فرمائیں تو جواب دیا مجھے سبق پڑھانے میں کوئی تکلیف نہیں، بلکہ راحت ہوتی ہے۔ بے جا نہ ہوگا اگر عرض کیا جائے کہ جس طرح فرشتوں کی غذا ذکر اللہ ہے حضرت کی غذا درس حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تھی۔ اس

شوق اور جذبے کا اثر تھا کہ آپ درس میں تشریف لانے کے لیے کوئی سواری گوارا نہیں کرتے تھے اس مقدس شغل کے لیے پا پیادہ تشریف لاتے تھے کہ تقاضائے شوق یہی تھا۔

ویسے تو ہر وقت حضرت کی شان الگ اور نرالی تھی۔ رفتار گفتار کی شان الگ، اسی طرح درس و تدریس کی شان الگ تھی، کپڑے انتہائی صاف اور عطر سے معطر، دارالحدیث میں تشریف لے جاتے تھے۔ احتراماً اکثر دوزانو ہو کر تشریف رکھتے تھے احترام حدیث کے پیش نظر حرکت بھی زیادہ نہیں کرتے تھے جب دوزانو ہو کر تشریف رکھتے تو توجہ سامنے کی طرف ہوتی درس کے وقت انتہائی بے تکلف ہو جاتے تھے کبھی کبھی ہنسی مزاح بھی فرماتے تھے۔ مقصد یہ ہوتا تھا کہ طلبہ بے تکلف استفادہ کر سکیں اور اشکالات پیش کرنے میں جھجک محسوس نہ کریں رات کے سبق میں خصوصاً بہت زیادہ بے تکلف ہو جاتے تھے۔ درس گاہ میں داخل ہو کر آپ پہلے سلام فرماتے تھے اور طلبہ بھی اس نعمت عظمیٰ کے منتظر رہتے تھے علم کے احترام کا یہ عالم تھا کہ راستے میں کاغذ کا ٹکڑا مل جاتا تو فوراً اٹھا لیتے فرماتے اس کاغذ کے ذریعے علم کی حفاظت ہوتی ہے۔ جب بخاری شریف میں مسواک کے فیض کے ابواب شروع ہوتے تو آپ کا خاص طریقہ تھا کہ طلبہ کو مسواکیں عطا فرماتے۔ آخری سال یہ ابواب ابھی شروع نہیں ہوئے تھے کہ حضرتؒ علیل ہو گئے حضرت مولانا سید فخر الدین احمد کے درس میں مسواک کے ابواب آئے تو طلبہ نے حسب دستور مسواک کا مطالبہ کیا۔ حضرت نے بستر علالت سے کہلا بھیجا کہ اس وقت مسواک موجود نہیں ہیں یہ میرے ذمہ قرض ہے۔ انشاء اللہ ادا کر دوں گا، مگر افسوس اجل نے فرصت نہ دی تو وفات کے بعد پانچویں روز ۱۷ ربجمادی الاول ۱۳۷۷ھ کو صاحبزادہ صاحب مولانا اسعد صاحب مدظلہ نے یہ قرض ادا فرمایا۔

تدریس کے علاوہ آپ کا بڑا شغلہ اشاعت و تبلیغ تھا در حقیقت ان مجاہدات کا تصور بھی انسان کو مبہوت کر دیتا ہے، جو حضرت ممدوح کو وعظ و تبلیغ کے سلسلے میں تکالیف برداشت کرنی پڑیں۔ بنگال کے دیہات جہاں ہر طرف ندیاں نالے بہتے ہیں، مگر آپ رات کے اوقات میں وعظ و تبلیغ کے سلسلے میں پا پیادہ خطرناک جنگلوں نالوں اور ندیوں کو طے کرتے ہوئے دیہات میں پہنچتے اور جتنے بھی آدمی جمع ہو سکتے ان کو خداوندی احکام سناتے۔ ایسا بھی ہوا کہ سفر کی تمام کیچڑ اور دلدل کو طے کر کے جس جگہ پہنچے، وہاں وعظ سننے والے صرف سات آٹھ آدمی ہی تھے مگر آپ مجمع کی قلت سے کبھی کبیدہ خاطر نہ ہوئے اور اسی بشاشت کے ساتھ ان کو احکام الٰہی سناتے جس بشاشت سے ہزار ہا ہزار کے مجمع کو سناتے۔ اس مجاہدے کا اثر بحمد اللہ بہت ہی خوشگوار ہوا چھوٹے

ہی عرصے بعد سارا ضلع سلہٹ آپ کی طرف متوجہ ہوگیا آپ کے اخلاق وایثار پر فریفتہ اور شیدائی ہوکر حلقۂ ارادت میں داخل ہونے لگا۔ سلہٹ اور اطراف کے رہنے والوں نے ہزاروں کی تعداد میں آپ سے شرف بیعت حاصل کیا۔ حضرت محترم ہی کا ظرف اور آپ ہی کی ہمت تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ راحت وآرام بے فکری اور سکون سب کچھ قربان ہوگیا شب وروز ایک مسلسل جدوجہد تھی جس کو وہ اِنسان انجام دے رہا تھا جس کو خدا نے فوق العادت روحانی قوت عطا فرمائی تھی۔ شب کو کئی گھنٹے مسلسل تقریر، اس کے بعد سفر اور پھر مدرسہ میں پہنچ کر کئی گھنٹے تک کئی سو طلبہ کی جماعت کو درس دینا، پھر اسی طرح ظہر کے بعد، عصر کے بعد اور بسا اوقات عشا کے بعد بھی درس برابر جاری رہتا۔ اور پھر ایک دو دن نہیں بلکہ ہمیشہ، مسلسل اور نہ صرف دن کو بلکہ شب کو اسی طرح مشاغل کا تسلسل، مثلاً قیام دیوبند کے دوران میں مغرب کے بعد صلوٰۃ الاوابین جن میں ڈیڑھ دو پارہ یومیہ کی تلاوت، پھر مسترشدین کو تلقین یا بیعت، پھر عشا کے بعد کتب بینی پھر آخر شب میں تہجد، اس کے بعد ذکر ومراقبہ وغیرہ۔ کیا کوئی ہے جو اس طرح مسلسل اپنے آپ کو قربان کرتا رہے اور پھر رمضان المبارک کا متبرک مہینہ تو عجیب ہی شان سے گزرتا۔ اہل سلہٹ حضرت کے کچھ ایسے ہی عاشق ہوگئے کہ رمضان المبارک کا متبرک مہینہ انھوں نے اپنے لیے مخصوص کرالیا تھا۔ تمام سال وہ تمناؤں اور مرادوں میں گزار دیتے تھے اور شعبان کے شروع ہوتے ہی دعوتی خطوط اور تار بھیجے لگ جاتے تھے اگر کچھ معمولی شبہ ہوجاتا تو سلہٹ سے وفود حاضر ہونے لگ جاتے۔ بہر حال ۲۷، ۲۸ شعبان کو حضرت دیوبند سے روانہ ہوکر سلہٹ پہنچ جاتے وہاں پہنچ کر آپ کے مشاغل حیرت انگیز ہوجاتے۔ پورے بنگال سے خاص خاص متوسلین سلہٹ پہنچتے، کچھ قیام کرتے اور کچھ زیارت کرکے اور دو چار روز حاضرِ خدمت ہوکر واپس ہوجاتے۔ اوسطاً چھ سات سو حضرات کا مجمع جمع رہتا حضرت مرحوم مختصر سے افطار کے بعد مغرب کی نماز سے فارغ ہوکر صلوٰۃ الاوابین میں مشغول ہوجاتے ڈیڑھ دو پارہ کی تلاوت کرکے پھر تراویح میں چھ سات سو آدمی کے ساتھ شریک ہوجاتے۔ قرآن مجید حضرت شیخ خود سناتے مسجد میں تراویح سے فراغت کے بعد قرآن نوافل میں شروع ہوجاتا پھر تہجد شروع کردیتے جس میں سلسلہ وار قرآن مجید ختم کردیتے تہجد کے بعد ذکر وتلقین کا مشغلہ صبح صادق سے تقریباً نصف گھنٹہ پہلے تک جاری رہتا نمازِ صبح سے فراغت پاکر کچھ تھوڑا سا آرام فرماتے۔ آٹھ بجے سے زائرین سے ملاقات اور مجمع زائرین میں وعظ وپند کا سلسلہ شروع ہی رہتا۔ پھر دوپہر کو خفیف سا قیلولہ فرماتے نمازِ ظہر کے بعد قرآن مجید سننے اور سنانے کا سلسلہ عصر

تک جاری رہتا بعد میں عصر سے مغرب تک تذکیر و تلقین میں صرف ہوتا۔ اسی طرح رمضان میں دن اور رات نو نو دس دس قرآن مجید کا سلسلہ جاری رہتا۔ مجلس وعظ وغیرہ ان کے علاوہ ہوتیں۔ سارا رمضان شریف اسی طرح گزار دیتے۔

نماز عید سے فارغ ہو کر واپسی ہوتی بنگال سے دیوبند تک متوسلین اور مشتاقوں کے تقاضوں کے بموجب موقع بہ موقع قیام فرماتے۔ گویا تبلیغی دورہ فرماتے ہوئے آخر شوال تک حضرت والا دیوبند پہنچتے پھر اگر حج بیت اللہ کا ارادہ ہوتا تو یہ مسلسل سفر متواتر چار ماہ باقی رہتا جس میں آرام اور راحت کا نام تک نہ ہوتا۔ حجاز پہنچ کر بھی زائرین کی کثرت آرام کا موقع نہ دیتی بلکہ حضرت تو خود فرمایا کرتے تھے کہ دنیا میں آرام کے لیے نہیں آیا ہوں۔ سبحان اللہ! ان ۱۳۲۰ھ میں جب مدینہ طیبہ دوبارہ تشریف لے گئے اور سلسلۂ درس نے وسعت اختیار کی تو حدیث، تفسیر، اور فقہ وغیرہ کی چودہ پندرہ کتابوں کا درس دیتے تھے یہ سلسلۂ درس تہجد کے بعد سے شروع ہو کر نماز عشا ہی تک جاری رہتا تھا۔

حضرت مولانا عبدالحق صاحب مدنی کا بیان ہے کہ جب یہ خاندان مدینہ طیبہ پہنچا اور مستقل قیام کا ارادہ ہوا تو اس گھرانے پر کئی ماہ متواتر اس حالت میں گزرے کہ ایک وقت بس تین پاؤ مسور کی دال گھر کے تیرہ آدمیوں کے لیے پکتی اور گھر کے سب آدمی تھوڑی تھوڑی پی لیتے تھے اور خدا کا شکر ادا کرتے تھے رہائش کے لیے شہر سے باہر ایک قطعۂ زمین لے لیا تھا۔ عورتوں بچوں اور مردوں نے مل کر اپنے ہاتھ سے اینٹیں پاتھیں اور چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں تعمیر کی گئیں جن کی چھت اتنی نیچی تھی کہ کھڑا ہونے سے سر لگتی تھی اسی طرح رہائش کے سلسلے میں بھی سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسوۂ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر عمل کی سعادت میسر آئی۔

اس وقت مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ممدوح کے کچھ حالات تذکرۃ الرشید جلد دوم مصنفہ مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی کے الفاظ میں پیش کروں۔ مولانا فرماتے ہیں:

"شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ نے ۱۳۱۶ھ میں حضرت امام ربانی مولانا رشید احمد صاحب سے بیعت ہو کر والد اور برادران کے ہمراہ جد امجد کے بلدۂ طیبہ مدینہ منورہ میں اقامت اختیار کی تو معظمہ پہنچ کر حسب اجازت امام ربانی قدس سرہ اعلیٰ حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ سے رجوع کیا اور اذکار تعلیم فرمودہ قطب عالم پر بھی بہ ہمت تمام کار بند رہے۔ اس زمانے میں جو کچھ واردات عجیبہ و کیفیات غریبہ ظاہر ہوئیں ان کی اطلاع آستانہ عالیہ پر گنگوہ میں کرتے رہے، یہاں تک کہ ۱۳۱۸ھ میں حضرت کا والا نامہ پہنچا کہ چند روز کے واسطے گنگوہ اگر مجھ سے مل جاتے تو بہتر ہوتا۔

اس فرمان والا شان پر مطلوب بن کر باوجود تنگ دستی و بے سروسامانی کے مراجعت ہندوستان کا تہیہ کر لیا۔ باپ کا بہ اقتضائے محبت جی چاہا کر بھائیوں میں سے کوئی ایک رفیق سفر رہتا تو اچھا تھا۔ بڑے بھائی مولوی سید احمد صاحب جوان کے چار مہینہ آگے پیچھے سلسلہ خدام میں داخل ہوئے تھے، غلبۂ شوق کے سبب فرضی ضروریات ذاتی و خانگی قائم کر کے باپ سے ہمراہی برلور کی اجازت بھی لے چکے تھے، مگر قدرت کو منظور ہی کچھ اور تھا بڑے بھائی مولانا صدیق احمد صاحب در پردہ خفیہ انتظام کر کے چھپ کر چند روز پہلے روانہ بھی ہوئے جس کی اطلاع ۱۲ گھنٹہ بعد قریب مغرب ہوئی مجبوراً مولانا سید احمد صاحب کو ارادۂ سفر فسخ کرنا پڑا اور مولانا حسین احمد صاحب تنہا روانہ ہوئے۔ جدہ میں دونوں بھائی مل گئے اور حج بیت اللہ سے فارغ ہو کر گنگوہ پہنچے چند روز گزرے تھے کہ امام ربانی نے ایک ایک جوڑا ملبوس کرتا پائجامہ دونوں بھائیوں کو عطا فرمایا چوں کہ اس میں ٹوپی یا عمامہ نہ تھا اس لیے دونوں میں سے کسی صاحب نے دبی زبان میں عرض کیا کہ ارشاد ہو تو ہم خدام اپنا اپنا عمامہ حاضر کریں اپنے دست مبارک سے عطا فرمایا جائے۔ یہ سن کر حضرت نے سکوت فرمایا اور بہ مقتضائے ادب دونوں بھائی عطیہ قطب العالم کو سر آنکھوں پر رکھ کر شکر یہ ادا کرتے ہوئے اٹھ گئے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد بلائے گئے اور حکم ہوا کہ اپنے اپنے عمامے لے آؤ۔ جب دونوں بھائیوں نے اپنے اپنے عمامے حاضر کیے تو حضرت امام ربانی نے اپنے دست مبارک سے دونوں کے سروں پر باندھ کر ارشاد فرمایا کہ جانتے ہو یہ کیا ہے مولانا صدیق احمد صاحب نے دبی زبان سے عرض کیا کہ دستار فضیلت ارشاد ہوا دستار خلافت امام ربانی قدس سرہٗ کی قولی و فعلی خلافت کے مثال میں آپ کے خلفا کے اندر صرف یہی دو حضرات پیش کیے جاتے ہیں، جن کے کمالات علمیہ و عملیہ اسی سے ظاہر ہیں کہ مدنی مہاجر اور بطائی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے پڑوسی ہیں مولانا حسین احمد صاحب کا درس بحمد اللہ حرم نبوی میں بہت عروج پر ہے اور عزت و جاہ بھی حق تعالیٰ نے وہ عطا فرمایا ہے کہ ہندی علما تو کیا معنی یمنی شامی بلکہ مدنی علما کو بھی وہ بات حاصل نہیں۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔ آپ سرتا پا خلق اور مہمان نواز، غیور، باحیا اور بعض ان صفات حمیدہ سے متصف ہیں جن پر دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی ہے۔

مختصر یہ کہ زائد سے زائد ۲۲ سال کی عمر ہے کہ کہ چشمۂ رشد و ہدایت خود سے ساقی کو بلا کر خلافت صادقہ کا خلعت عنایت، فرما دیتا ہے زہے قسمت! اس سفر کی واپسی کے بعد ۱۳۲۶ھ تک مسلسل جوار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں قیام رہا۔ حرم پاک میں حلقۂ درس روز افزوں

ترقی کر رہا تھا اور آپ صحاح ستہ اور تفسیر فقہ کی بڑی بڑی کتابوں کے تقریباً چودہ پندرہ سبق روزانہ پڑھاتے تھے نمازِ صبح کے بعد سے سلسلہ درس شروع ہو کر عشا تک رہتا۔ آپ کی شہرت عرب سے تجاوز کر کے دیگر ممالک تک پہنچ چکی تھی اور شیخ الحرم کے خطاب سے آپ معروف ہو گئے تھے"۔ (صفحہ ۱۵۱ تا صفحہ ۱۵۹۔ تذکرۃ الرشید)

سبحان اللہ! دارالعلوم دیوبند ہی کے گلشن کا یہ ایک موتی تھا جس کو حضرت شیخ الہندؒ نے خود تعلیم دی۔ اندازہ فرمایئے کہ دارالعلوم دیوبند کا دنیا میں کتنا فیض ہوا حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ مرحوم، حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحبؒ، حکیم الامت حضرت شاہ اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ان کے علاوہ اور ہزاروں متبحر عالم دارالعلوم دیوبند ہی کا فیضان تھے۔ دنیا کے اندر ہزاروں انقلاب آئے، آتے رہتے ہیں اور آتے رہیں گے مگر دارالعلوم دیوبند کو یہ حیرت انگیز غیبی نصرت ملی کہ کسی بڑے سے مخالف کی مخالفت نے ایک بال برابر نقصان نہ پہنچایا اور انشاء اللہ تعالیٰ نہ پہنچا سکیں گے۔ انگریز سب سے بڑا دشمن اور مخالف تھا باوجود شدید مخالفت وعداوت کے ذرا بھی نقصان نہ پہنچا سکا، حالاں کہ حکومت اور راج انگریز کا تھا۔ آج وہ انگریز دشمن کہاں ہے؟ دیوبند اسی طرح موجود ہے اور انشاء اللہ موجود رہے گا۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو اہل اللہ سے دشمنی کرے گا اور عداوت رکھے گا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو جنگ کا چیلنج دیا جاتا ہے۔ انگریز جس نے اکابر دیوبند اہل اللہ سے بغض اور دشمنی رکھی اور ان کو نقصان پہنچانے کی اور دارالعلوم دیوبند کو ختم کر دینے کی ہر ممکن کوشش کی وہ خود ختم ہو گیا اور ہندوستان سے بھاگ نکلا۔ دیوبند کی یہ کھلم کھلا اظہر من الشمس کرامت اور عنداللہ مقبولیت کی دلیل ہے۔

غور فرمایئے! حکومت وراج انگریز کا دور اقتدار انگریز کا اور انگریز کی یہ اسکیم کہ تمام ہندوستان کی رعایا کو عیسائی بنایا جائے اس پر انگریز نے اپنی تمام طاقت خرچ کر کے پورا پورا زور دیا مگر بفضلہ تعالیٰ دارالعلوم دیوبند نے فتح پائی۔ دشمن انگریز شکست کھا کر بھاگ نکلا۔ اس قسم کی ہزاروں فتوحات اللہ تعالیٰ کے فیض وکرم سے دارالعلوم کو نصیب ہوئیں۔ آج دارالعلوم دیوبند کو اپنی مقبولیت کا فخر ہے۔ بڑی حیرت ہوتی ہے کہ انگریزوں کی شدید مخالفت کے باوجود علمائے دیوبند اتنا عظیم الشان کام کیوں کر سرانجام دے سکے۔

ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء ـــــ فاعتبروا یا اولی الابصار

(ماہنامہ الصدق، ملتان رجب المرجب وشعبان المعظم ۱۳۷۹ھ)

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ اپنے کردار کے آئینہ میں

عبدالمجید صاحب کلامی

بقول حضرت شیخ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ سب سے بڑی کرامت یہ ہے کہ کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کامل متبع ہو۔ آجکل عام لوگ شعبدہ بازی یا ظاہری خرقِ عادت اطوار و افعال کو کرامت سمجھتے ہیں، یہ نہیں سمجھتے کہ لادین اور ایمان سوز ماحول میں دہریت اور مادیت کے زمانے میں کوئی شخص اتباعِ سنت میں کامل ہو حقیقتاً ایسا ہی شخص "باکرامت ولی" ہے۔

آج کل ایک رُخ قصیدہ نگاروں کا یہ بھی ہوگیا ہے کہ کسی شخص کے دنیا سے انتقال کر جانے کے بعد اس کی تعریف و توصیف میں وہ قصائد کہے جاتے ہیں کہ جس کی کوئی انتہا نہیں اس لیے ان قصائد سے قطع نظر حضرت شیخ الاسلام شیخنا و محبوبنا سیدنا مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نور اللہ مرقدہٗ کی زندگی کے چند حقائق پیش کرتے ہیں تاکہ دنیا جس مبارک ذات کو ان کی حیات مبارکہ میں نہ پہچان سکی ان کے واصل باللہ ہونے کے بعد ہی کچھ پہچان لے۔

حضرت کی زندگی کے تمام اعمال سنتِ نبویہ کی اتباع میں ہی ہوتے تھے۔ آج ہم لوگوں کی عمومی زندگی میں اول تو سنت کا اہتمام ہی نہیں ہے اور اگر ہے تو بڑے امور میں لیکن حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کا ہر چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا کام اتباعِ سنت میں تھا۔ چند مثالیں پیش ہیں:

(۱) سنتِ مبارکہ یہ ہے کہ مسجد میں جاتے وقت دایاں پیر پہلے رکھا جائے اور نکلتے وقت بایاں پیر پہلے نکالا جائے اس کے برخلاف جوتا پہننے میں سنت یہ ہے کہ پہلے

قاضی شہر آگرہ (یو۔پی)

دائیں پَیر میں پہنا جائے اس کے بعد بائیں پَیر میں۔ ان دونوں سُنّتوں پر مسجد میں داخل ہونے اور مسجد سے باہر آنے کے وقت عمل کرنا دشوار معلوم ہوا کرتا ہے۔

حضرت دونوں سُنّتوں پر عمل اس طرح کرتے تھے اور اس کے پابند تھے کہ مسجد میں جاتے وقت اوّل جوتا بائیں پَیر سے نکال کر پَیر کو جوتے پر رکھ لیتے اس کے بعد دائیں پَیر سے جوتا نکالتے اور اس کو پہلے مسجد میں داخل کر دیتے اس کے بعد جوتے پر رکھا ہوا بایاں پَیر مسجد میں داخل کرتے مسجد سے نکلتے وقت پہلے بایاں پَیر نکال کر جوتے پر رکھتے پھر دایاں پَیر نکال کر اس میں جوتا پہن لیتے اس کے بعد بائیں پَیر میں جوتا پہنتے۔

(۲) آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس عالی صفت کے مطابق جب بھی کسی سے گفتگو فرماتے خوش اخلاق کے ساتھ اور اس طرح بات فرماتے کہ مخاطب سمجھتا کہ سب سے زیادہ حضرت مجھ سے محبت کرتے ہیں آپ کی گفتگو کا انداز مزاحیہ بھی ہوتا حضرت شیخ رحمتہ اللہ علیہ کے متعلق ان کا ہر معتقد، ہر مرید، ہر ہم نشیں یہی سمجھتا ہے کہ حضرت کو مجھ سے خاص تعلق تھا۔

(۳) آپ کے یہاں مہمانوں کا خاص اہتمام تھا اُن کا خاص اکرام ہوتا تھا۔ رات میں ہر مہمان کو ایک پلنگ اور بستر حضرت کے یہاں سے ہی ملتا۔ خاص بات یہ کہ مہمان اپنا بستر خود نہ بچھا سکتا تھا اور نہ پلنگ اٹھا کر جا سکتا تھا ورنہ حضرت کا خادم پر عتاب ہوتا۔ آپ کا دسترخوان نہایت سادہ ہوتا۔ اس کھانے میں بھی سُنّت کا ایسا اہتمام کہیں نہ دیکھا ایک بڑی پلیٹ میں ترکاری ہوتی امیر و غریب، ادنیٰ و اعلیٰ، عالم و جاہل سب اسی پلیٹ میں ہاتھ ڈالتے۔ روٹیاں سب حضرت کے پاس دسترخوان میں لپٹی ہوتیں جو حسبِ ضرورت اس طرح تقسیم کی جاتی رہتیں جیسے کہ ایک شفیق باپ اپنے لاڈلے فرزندوں کو شفقت کے ساتھ کھلاتا ہے۔

ہمیشہ حضرت کے دسترخوان پر گوشت ضرور دیکھا آپ نے مزاحیہ طور پر ایک مرتبہ فرمایا مسلمان کے دسترخوان پر اور گوشت ہی نہ ہو حضرت سے بالکل ملحق مجھے ایک روز کھانا کھانے کا اتفاق ہوا۔ میں نے بغور سُنا حضرت بہت آہستہ ہر لقمے کے بعد فرماتے تھے۔ اللّٰھم لک الحمد و لک الشکر ک ۔۔ اس کے علاوہ بھی بعض دعائیں سُنیں جو سمجھ میں نہ آسکیں۔

(۴) کسی شخص سے بھی وہ اپنا اعزاز نہ چاہتے۔ آپ جب کسی مجلس میں تشریف لے جاتے اور اہل مجلس آپ کے اعزاز میں استادہ ہوتے تو یہ امر سخت ناگو ہوتا جب تک آپ اہل مجلس کو بٹھا نہ لیتے مجلس میں تشریف نہ لاتے بلکہ دروازہ پر ہی رک کر کھڑے ہو جاتے اور فرماتے، پہلے آپ سب لوگ بیٹھ جائیں جب سب لوگ بیٹھ جاتے، تب آپ مجلس میں تشریف لاتے اور پھر اپنی طرف سے ناراضگی کا اظہار فرماتے۔

(۵) خلاف سنّت امر آپ کو سخت، ناگوار تھا داڑھی نہ رکھنے والوں یا کتروانے والوں پر سخت عتاب فرماتے۔

(۶) آپ کے در سے کوئی بھی سائل محروم نہ جاتا تھا حتیٰ کہ ایک مرتبہ ایک بھروپیہ ضرورت مند بن کر آیا۔ آپ سے سوال کرنے لگا اوّل آپ نے اس کو اس فعل سے باز آجانے کے لیے نصائح فرمائے لیکن وہ جب رخصت ہونے کے لیے کسی طرح تیار نہ ہوا تو آپ نے ایک بچہ سے گھر سے کچھ منگا کر دے دیا اس کے علاوہ وہ واقعات الگ ہیں کہ کتنے ہی طلبہ کو آپ کی طرف سے کھانا وغیرہ دیا جاتا تھا اور کتنے غیر طلبہ ضرورت مند سوالی آپ سے دامن مراد بھر کر لے جاتے تھے۔ بہر حال سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ عالی صفت کہ آپ کسی کو انکار نہ فرماتے تھے یہ آپ کی زندگی میں بدرجۂ اتم موجود تھی آپ جب کبھی سلہٹ یا اپنے وطن مالوف ٹانڈہ ضلع فیض آباد مراجعت فرماتے۔ پسنجر ٹرین کے ذریعے سفر فرماتے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ ضلع بجنور، مراد آباد، سہارنپور، مظفر نگر، میرٹھ وغیرہ کے عقیدت مندوں نے آپ سے درخواست کی کہ آپ ایکسپریس یا میل کے ذریعے ہمارے علاقوں سے گزر جاتے ہیں ہم سب آپ کے دیدار سے محروم رہتے ہیں اگر حضرت والا پسنجر کے ذریعے سفر فرمایا کریں تو حضرت کی زیارت سے ہم مشرف ہو جایا کریں گے۔ چنانچہ حضرت نے محض اللہ کے بندوں کو خوش کرنے کے لیے ان علاقوں کے سفر پسنجر ٹرین سے شروع کر دیے اور آپ کی آمد و رفت کے مواقع پر ہر اسٹیشن پر کثیر تعداد میں معتقدین حضرت کی زیارت سے اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کرتے۔ مجھے جب بھی اسٹیشن پر زیارت کا اتفاق ہوا خواہ کوئی بھی وقت ہو دن کا ہو یا رات کا حضرت کو کھڑکی کے پاس بیٹھا پایا۔ حضرت کے چہرہ سے سفر کی تکان محسوس ہوتی نہ نیند کا خمار نہ گرانی۔ کھڑکی پر جب عقیدت مندوں کا جم غفیر پہنچتا تو حضرت ایک

ہی مسکراہٹ میں لوگوں کے قلوب پر فیضانِ عرفان کی بارش فرما دیتے۔ ان حاضرین میں جو شخص نہ ہوتا آپ اس کے بارے میں دریافت احوال فرماتے۔ بہت سے ضرورت مند وہاں بھی دعا کی درخواست کرتے۔ حضرت اسی وقت دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیتے کوئی شخص تعویذ کی فرمایش کرتا اسی وقت اپنے ہم سفر کو حکم ہوجاتا وہ آپ کے بیگ میں سے تعویذ نکال کر تعمیل کر دیتا۔ الغرض آپ خود ملاحظہ فرمائیں بغیر کسی روحانی شخصیت کے اس قدر شفقت کے ساتھ سفر کرنا اور محض اپنے محبین کی درخواست پر سفر ہی پسنجر ٹرین سے شروع کر دینا ہر کس و ناکس کے لیے ممکن ہی نہیں۔ لیکن دوسری طرف آپ کا امور سیاست میں اشتغال شاید عام حضرات کو شبہ میں ڈالتا ہے کہ یہ سیاسی پہلو ایک درویش باخدا کے ساتھ کس طرح منسلک ہو سکتا ہے ایسا سوچنا دینی بصیرت کی کمی ہے اسلام میں سیاست کا اہم مقام ہے جو دین سے خارج نہیں لیکن آپ کا سیاست کے انہماک و اشتغال کے ساتھ اپنے روزمرہ کے ذکر شغل اور انفرادی و اجتماعی زندگی میں سنّت کا رجحان اور اس کا انتہائی ارادتاً اہتمام یہ خاص الخاص حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کا ہی حصہ ہے جو حضرت شیخ کی شخصیت کو ممتاز بنا دیتا ہے۔ یہ دونوں پہلو ساتھ رکھ کر چلنا ہر آدمی کا کام نہیں لیکن ہاں اکمل ترین انسان کی علامت ضرور ہے یا یوں سمجھیے اہل اللہ اور وہ باخدا لوگ جن کا اللہ تبارک و تعالیٰ سے خاص تعلق ہوتا ہے ہمیشہ اپنے کو چھپایا کرتے ہیں اور دنیا میں ایسے حال میں رہتے ہیں، لوگ ان کے علوِ مراتب سے بے خبر رہتے ہیں آپ کا سیاست میں اشتغال ایک پردہ بھی ہے جو اپنے باطن کو چھپانے کے لیے استعمال کیا گیا مگر یہ بھی معمولی بات نہیں یہ پردہ بھی معمولی پردہ نہیں الغرض آپ کا سیاست میں اشتغال متبع سنّت ہونے پر ایک مہر ہے۔ (روزنامہ الجمعیۃ دہلی ۱۰ فروری ۱۹۵۸ء)

مشاغل صوفیہ اور انکی تاثیریں
شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کی سیرت کے آئینے میں

مولانا سیّد محمد میاںؒ

گجراتی زبان کے ماہنامہ پیام کے مالک و ایڈیٹر جناب محترم منشی عیسیٰ بھائی ابراہیم صاحب، حضرت شیخ الاسلام قدس اللہ سرہ العزیز کے خصوصی متوسلین میں سے ہیں آپ نے اپریل ۵۸ء میں "پیام" کا مدنی نمبر شائع کیا ہے۔ منشی عیسیٰ بھائی کے اصرار پر رسالہ پیام کے لیے مولانا محمد میاں صاحب نے ایک مضمون لکھا تھا اس کا گجراتی ترجمہ پیام کے مدنی نمبر میں شائع کیا گیا ہے اُردو کا اصل مضمون حسبِ ذیل ہے۔ (افضال الٰہی)

آؤ۔ آج نئی طرح کی باتیں کریں۔ زمانہ نیا ہے تو باتیں بھی نئی طرح کی ہونی چاہئیں۔ ایسا کرو۔ تم "ہاں" کہو ہم کہیں گے "نہیں"، اور پھر ثابت کریں گے کہ "نہیں" ٹھیک ہے "ہاں" غلط ہے۔

دیکھو۔ اپنے سامنے کی چیزوں پر نظر ڈالو، یہ رسالہ ہے جسے تم پڑھ رہے ہو، یہ ہاتھ ہیں جن میں یہ رسالہ لیے ہوئے ہو یہ "روشنی" ہے جس میں تم یہ رسالہ پڑھ رہے ہو تم یہی کہو گے کہ یہ سب چیزیں "ہیں"، ہم کہیں گے کہ "نہیں"، ہاں تم کہو گے "ہم لکھے پڑھے ہیں" جبھی تو یہ رسالہ پڑھ رہے ہیں ہم بینا "بصیر" یعنی دیکھنے والے ہیں۔ اسی بینائی کی بدولت یہ رسالہ دیکھ رہے ہیں۔ ہم فہیم اور سمجھ دار ہیں، چنانچہ یہ مضمون سمجھ رہے ہیں۔ ہم کہیں گے نہیں کچھ بھی نہیں۔ غرض تم کہتے جاؤ ہاں۔ ہم کہتے جائیں گے۔ نہیں۔ مگر یہ معمہ کیا ہے۔ اور اس کا فائدہ کیا۔

سابق ناظم جمعیت علمائے ہند مصنف علمائے ہند کا شاندار ماضی (چار جلدیں) علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے و مصنفات کثیرہ و مفیدہ

یہ مضمون ہے یا مذاق! آپ بہت سے معمّے حل کیا کرتے ہیں۔ آج یہ معمّہ حل کیجیے۔ بات ہماری ہی صحیح ہے۔ ایک مثال سمجھ لیجیے۔ پھر ہماری بات بھی سمجھ میں آجائے گی۔

جب دھوپ نکل رہی ہو۔ آپ کسی درخت پر نظر ڈالیے درخت کے سایے میں جگہ جگہ دھوپ چھن چھن کر آرہی ہے جس سے سایہ کی مختلف صورتیں بن گئی ہیں کوئی گول کوئی لانبی، کوئی چوکور، کوئی ہشت پہلو، کوئی گاجر کی شکل کوئی گیند کی شکل۔

اب ان شکلوں کو آپ کیا کہیں گے "ہے" یعنی "ہست" کہیں گے۔ یا نہیں" اور "نیست" کہیں گے؟ ممکن ہے آپ جلدی میں یہی کہہ دیں کہ یہ ہست۔ اور "اثبات" ہیں لیکن آپ کچھ بھی تحمل اور غور کریں گے تو فوراً سمجھ جائیں گے کہ آپ نے غلطی کی ہے۔ سایہ۔ اور چھاؤں کی حقیقت ہی نفی یعنی "نہ ہونا" ہے۔ کیونکہ سایے کے معنی ہیں نور کا نہ ہونا۔ تو موجود اور مُثبَت جس کو "ہے"۔ اور ہست کہا جائے۔ وہ تو "نور" ہے اور اس کے سوا جو کچھ بھی ہے۔ یہاں تک کہ اگر آسمان اور زمین بھی ہیں تو وہ سب سایہ ہیں، جن کی حقیقت نفی اور نہ ہونا چاہیے۔ اللہ نور السموات والارض

خود اپنا وجود بھی اس نہ ہونے میں داخل ہے۔ "ہست" اور "ہونا" صرف اس سے لگا ہوا ہے جو اس نور حقیقی کا پرتو ہے یا جن کو صفاتِ کمال کہا جاتا ہے۔ مثلاً تقدس۔ تنزہ۔ پاکبازی۔ اور غیر اللہ سے پرہیز اجتناب و احتیاط۔ یادِ خدا میں انہماک و استغراق۔ ذکر۔ فکر۔ فیہ رجال یحبون ان یتطھروا واللہ یحب المطھرین۔۔۔۔۔ الآیہ (سورہ توبہ)

والذین کفروا اعمالھم کسراب بقیعۃ یحسبہ الظمآن ماءً۔۔۔۔۔ الآیہ (سورہ نور)

یہ قصہ تو بہت لمبا ہے ہمیں تو مثال دے کر یہ سمجھانا ہے۔ مشائخ طریقت اور صوفیۂ کرام جو طریقے بتاتے ہیں ان کا بڑا مقصد یہی ہوتا ہے کہ نفی اور اثبات "ہے" اور "نہیں" کے تصور کو صحیح کر دیں ہم جو خود اپنی نمود خود بینی اور خود نمائی میں غرق۔ اور دنیائے فانی کے تماشے میں محو ہیں۔ ہم بیدار ہوں۔ اپنی بے حقیقتی کو سمجھیں اور نہ صرف سمجھیں بلکہ اس کا یقین کریں اور یہ یقین اس درجے بڑھ جائے کہ ہمارے تمام جذبات، تمام خیالات، تمام ارادے اور خواہشات، اس کے تابع ہو جائیں۔ ہماری اپنی خواہش کچھ بھی نہ رہے۔ جو اللہ کا حکم اور اس کے رسول کی سنّت ہو (صلی اللہ علیہ وسلم) وہی ہماری خواہش اور چاہ بن جائے۔

طریقت اور مسلک۔ صوفیۂ کا پہلا سبق۔ نفی اور اثبات ہوتا ہے۔ مثلاً کلمۂ طیبہ

لا الٰہ الا اللہ ۔ کے معنی ہم یہ سمجھتے ہیں ۔ نہیں کوئی معبود ۔ مگر اللہ ۔ مشائخ طریقت فرماتے ہیں کہ یہ تو ظاہری معنی ہیں ۔ آپ حقیقت کی طرف رجوع کیجیے پہلے یہ معنی ذہن نشین کیجیے کہ لا محبوب الا اللہ نہیں کوئی محبوب ۔ مگر اللہ ۔ صرف ذہن نشین ہی نہیں بلکہ اس معنی کو اپنے اوپر حاوی کر لیجیے ۔ اس طرح کہ بقول حضرت شیخ الاسلام قدس اللہ سرہ العزیز ۔

"محبت صرف اللہ سے ہو ۔ البتہ حقوق سب کے ادا کیے جائیں"، یعنی بیوی اور بچوں اعزا و اقارب سے تعلق اس بنا پر رہے کہ اللہ نے حکم فرمایا ہے ۔ حکم محبوب کی تعمیل بھی محبوب ہوتی ہے لہٰذا اس کی تعمیل کی جا رہی ہے لیکن جہاں تک گرویدگی ، شیفتگی ، عشق و محبت کا تعلق ہے وہ صرف اللہ سے مخصوص ہو ، یا اللہ کے محبوبوں سے ۔ سلوک و طریقت کا دوسرا سبق یہ ہوتا ہے کہ لا اللہ الا اللہ کا تصور اس طرح کرو ۔ لا موجود الا اللہ ۔ اور اس کو اس درجہ اپنے اُوپر حاوی کر لو کہ خود اپنا اور اپنی حقیقت و انانیت اور اس بات کا تصور کہ میں کچھ ہوں" فنا ہو جائے اپنے اُوپر اور اپنے متعلق جو تصور غالب رہے وہ یہ کہ ہیچ در ہیچ کچھ نہیں! کوئی حقیقت نہیں! کوئی طاقت نہیں کوئی قوت نہیں لا حول ولا قوۃ ـــــ الا باللہ کمالِ طریقت یہی ہے یہی کمالِ عبدیت ہے ۔ تواضع اور انکسار اس کے مظاہر اور عملی شکلیں ہیں ۔ کہنے کو تو ہر شخص یہی کہتا ہے کہ میں ہیچ در ہیچ ہوں ۔ میری کچھ حقیقت نہیں ۔ یعنی تواضع اور انکسار کی نمایش بھی ہماری تہذیب کا اہم جزو بن گئی ہے ۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ چیز نمایش کی نہیں ۔ اس کا تعلق انسان کے باطن اور باطنی جذبات سے ہے اور اس کا امتحان اس وقت ہوتا ہے جب باطنی جذبات میں تعادم اور تلاطم پیدا ہو ۔ ایک طرف ایسی چیزیں ہوں جو خود آپ کے نظریہ کے لحاظ سے ترقی ، برتری ، کامیابی ، بلندی اور سرفرازی قرار دی جا سکیں ۔ آپ کے پاک جذبات بھی ان سے نشاط اور مسرت و سرمستی حاصل کریں ۔ اس وقت اگر آپ پر تواضع اور انکسار کا غلبہ ہو ۔ اس وقت یہ حقیقت کہ میں ہیچ در ہیچ ہوں ، سامنے ہو ۔ اور اپنی بے حقیقتی کا یقین کارفرما ہو یعنی ایسے موقع پر کہ آپ کو خود اپنے نظریات و اعتقادات کے لحاظ سے عروج اور برتری حاصل ہو رہی ہو ۔ اس وقت اگر تواضع اور انکسار پایا جائے ایک طرف آپ کے لیے موقع ہو کہ "ہے" اور "ہست" کا تصور قائم کریں اس وقت اگر اپنے لیے "نہیں" اور "نیست" کا یقین قائم رہے تو بے شک آپ سلوک و طریقت کے امتحان میں اعلیٰ درجہ کی کامیابی حاصل کر رہے ہیں اور اگر یہاں آپ کے مرکزی تصور میں فرق آ جاتا ہے تو آپ سب

کچھ ہو سکتے ہیں مگر مرشد کامل اور میدانِ طریقت کے شہسوار نہیں ہو سکتے۔

حضرت شیخ الاسلام قدس اللہ سرہ العزیز کی حیاتِ مقدسہ میں اس کی اعلیٰ مثال ملاحظہ فرمائیے۔

حضرت شیخ الاسلام قدس اللہ سرہ العزیز دارالعلوم دیوبند سے سندِ تکمیل حاصل کر کے مدینہ طیبہ جاتے ہیں۔ جاتے ہوئے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہو جاتے ہیں اور مکہ معظمہ پہنچ کر قطب العالم شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی سے کسبِ فیض کرتے ہیں پھر سید الکونین رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے دربارِ مقدس میں ذکر و فکر، مراقبہ، مجاہدہ، و ریاضت میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ حضرت کے شیخ و مرشد قطب وقت امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ آپ کو گنگوہ طلب فرماتے ہیں۔ اور مراحلِ طریقت کی تکمیل کرا کر دستارِ خلافت عطا فرماتے ہیں۔

غور فرمائیے کس قدر خوشی کا مقام ہے تکمیل کے بعد دستارِ خلافت کتنا مقدس عطیہ ہے۔ کتنا مبارک وقت ہے۔ سالہا سال سے ریاضت کرنے والے عمر رسیدہ علمائے ہند یہ سعادت اور یہ شرف اب تک نہیں حاصل کر سکے ایک نوجوان جس کی عمر بمشکل پچیس، چھبیس سال ہو گی اس بلند ترین مرتبے پر فائز ہو رہا ہے اس نوجوان کے لیے یہ عروج و ترقی کس قدر مسرت بخش و نشاط انگیز ہو سکتی ہے۔ مگر خود خوش نصیب مبارک و مسعود نوجوان کی حالت کیا ہے؟ خود اس کی شہادت اپنے قلم سے لکھی ہوئی یہ ہے:

"جس وقت حضرت رحمۃ اللہ علیہ میرے سر پر عمامہ باندھ رہے تھے مجھ پر زوردار گریہ طاری تھا اور اپنی کم مائیگی اور خجالت کا شدید احساس تھا۔ مجھ پر اس وقت صدمہ تھا کیوں کہ اپنی ناقابلیت، نامرادی اور بدحالی مشاہدہ تھی (نظروں کے سامنے تھی)، اور اس صدمے کا اثر چہرے اور گفتار و رفتار وغیرہ پر ظاہر تھا۔ مولانا صادق الیقین صاحب مرحوم (خلیفۂ خاص حضرت گنگوہیؒ) جب کہ اس صدمے کا مذاکرہ ہو رہا تھا اور میں نے اپنی بدحالی اور بے بضاعتی کا تذکرہ کیا تھا۔ فرمایا۔ کہ مخبر صادق نے خبر دی ہے اس کا اعتبار ہونا ضروری ہے۔"

(نقشِ حیات ص ۱۰۱)

ایک طرف مرشد کامل۔ قطب وقت جو ارشاد تلقین اور مُریدوں کی تربیت کے بارے میں بہت سخت اور اپنے اصول کا انتہائی پابند ہے۔ اس کی جانب سے اتنی مسرت کے ساتھ خرقۂ خلافت کی عطا اور نہ صرف عطا بلکہ یہ خوش خبری بھی سنائی جا رہی ہے کہ

"جو تعلیم میں نے دی ہے وہ سب کی بالکل آخری تعلیم ہے۔ یہاں پر تمام سلسلے (نقش بندیہ، چشتیہ، قادریہ وغیرہ) مل جاتے ہیں اسی کی مشق کرو۔ اسی میں جد وجہد کرکے پیر مرید سے بڑھ جائے یا مرید پیر سے۔"

دوسری طرف اپنی نظروں کے سامنے یہ بے حقیقتی یہ بے مائیگی اور یہ بدحالی کہ بے اختیار گریہ جاری ہے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ کمال عروج میں یہ کمال تواضع، یہ ہے کمالِ تصوف اور ذکر نفی و اثبات کی مکمل اور عجیب و غریب تاثیر۔ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ

آیئے اس موقع پر سرورِ کائنات، فخرِ موجودات، محبوبِ ربِ العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ کا بھی ایک صفحہ مطالعہ کرلیں:

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غارِ حرا میں ریاضت و مجاہدہ، شب بیداری اور یادِ خدا میں معروف ہیں اس چلہ کشی یا گوشہ نشینی پر کئی ماہ گزر گئے ہیں رحمتِ حق "جل مجدہٗ" موجزن ہوتی ہے اور وہ درجہ عطا ہوتا ہے جو انسانی عظمت کا سب سے بلند مقام ہے یعنی روح الامین آتے ہیں۔ اعتمادِ خداوندی کا سب سے بڑا وثیقہ یعنی خلعتِ نبوت پیش کرتے ہیں ساتھ ہی اس مکمل ترین پیغام کا آغاز ہوتا ہے جو صرف آخری پیغام ہی نہیں بلکہ اتنا مکمل پیغام ہے کہ اس کو حضرتِ حق جل مجدہٗ کی خلعت قرار دیا گیا ہے۔ یہ عروج و ترقی کا وہ آخری مرتبہ ہے جو عالمِ انسانیت کو سب سے پہلی اور سب سے آخری بار عطا ہوا۔ نہ کسی کو اس سے پہلے ایسا کلام اور ایسی وحی عطا کی گئی۔ نہ کائنات کے آخری نقطے تک کسی کو دی جائے گی۔"

کتنی خوشی اور مسرت کا مقام ہے۔ خوشی سے وجد آجانا چاہیے۔ رقص و سرود نہ ہو تو جشن مسرت تو اعلیٰ پیمانے پر ہونا چاہیے مگر یہاں کیا حالت ہے۔ دل کانپ رہا ہے قلب مبارک پر لرزہ طاری ہے قلبی تاثر نے جسم مبارک کو بھی متاثر کردیا ہے خدا جانے غارِ حرا میں کتنی دیر تک

یہ حالت رہی غار سے اُتر کر کئی میل لمبی مسافت طے کر کے کاشانۂ خدیجۃ کبریٰ میں پہنچے (رضی اللہ عنہا) دل اب تک قابو میں نہیں ہے۔ لرزہ اور بخار کی سی کیفیت ہے۔ حضرت خدیجہ سے فرمایا جا رہا ہے "زملونی زملونی" "مجھے ڈھانپ دو" "مجھے ڈھانپ دو"۔ کچھ دیر بعد یہ کیفیت رفع ہوئی مگر اضطراب اب بھی باقی ہے۔ حضرت خدیجہؓ سے فرمایا جا رہا ہے مجھے تو خطرہ ہی ہے۔ یہ ذمہ داری میں نہ سنبھال سکوں گا۔ میں تو ہلاک ہو جاؤں گا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا بار بار اطمینان دلا رہی ہیں کہ جو اعلیٰ اخلاق اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائے ہیں ایسے مکارمِ اخلاق کا مالک، ان ذمہ داریوں کو برداشت کر سکتا ہے مگر طبیعت اب بھی مضطرب ہے حضرت خدیجہؓ اس زمانے کے بہت بڑے عیسائی فاضل جناب "ورقہ" کے پاس لے جاتی ہیں وہ آپؐ کو اطمینان دلاتے ہیں (وغیرہ وغیرہ)

بہر حال اس انتہائی عروج، مقبولیت اور اس اعلیٰ شرف و عظمت کے ساتھ یہ اضطراب اور یہ لرزہ کیوں ہے مادہ پرست دنیا کے عقل پرست، مصنف و مورخ پریشان ہیں طرح طرح کی توجیہیں اور تاویلیں کر رہے ہیں۔ مگر "چہ داند بوزنہ لذتِ ادرک" جو اس وادی سے ناآشنا ہیں وہ اس معمے کو کس طرح حل کر سکتے ہیں لیکن حقیقت اور واقعہ یہ ہے اس اضطراب کا اصلی سبب وہی تواضع اور انکسار ہے یعنی اپنے متعلق ہیچ در ہیچ بلکہ صفر محض ہونے کا یقین، اللہ تعالیٰ عز و جل پر پورا اعتماد کرتے ہوئے، اپنے متعلق پوری بے اعتمادی، بدظنی اپنی حاجت مندی، اور بے چارگی کا یقین اور مشاہدہ جو ایک بندہ ہونے اور عبدیت کا کمال مانا جاتا ہے اور اسی کو طریقت و تصوف کی اصل روح اور خدا رسی اور مقبولیت کا اصل مغز تسلیم کیا جاتا ہے۔

ایک نبی اور اولوالعزم رسول بلکہ افضل المرسلین اور ایک اُمتی میں جو فرق ہونا چاہیے وہ محتاج بیان نہیں۔ معاذ اللہ، مساوات اور کسی بھی درجہ میں برابری کا تصور بھی سوءِ ادب، گستاخی اور سراسر گناہ ہے۔ ظاہر کرنا یہ ہے کہ دستارِ خلافت کے وقت، اس عالم و فاضل اُمتی (حسین احمد) کے قلب مبارک میں جو تواضع، انکسار فروتنی اور عاجزی، کی لہریں دوڑ رہی ہیں وہ فیض ہے اسی سرچشمۂ اقدس کا جس کو خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کہا جاتا ہے اس آبگینہ میں جو چمک ہے وہ پرتو ہے اسی آفتاب کا جس کو محبوبِ ربُّ العالمین اور رحمۃ للعالمین قرار دیا گیا ہے۔

غیر اختیاری طور پر محض عطائے خداوندی سے اس اتباع سنت پر جس قدر غبطہ کیا جائے بجا ہے ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ

قرآنِ پاک اور احادیثِ مبارکہ میں صحابۂ کرام کے بہت سے فضائل اور مناقب وارد ہوئے ہیں، متعدد صحابۂ کرام کو خاص طور پر بشارتیں دی گئی ہیں، کسی کو جنت کے اعلیٰ مراتب کی۔ خلفاء راشدین عشرہ و بشرہ اور اہلبیت کے متعلق جو واضح اور صاف اور بشارتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی لسان مبارک سے صادر ہوئی ہیں وہ عام طور پر مشہور ہیں ان کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں لیکن عجیب و غریب کمال یہ ہے کہ ایک طرف یہ اکابر خود اپنے متعلق اس ذاتِ اعلیٰ اور اقدس سے جس کا ہر قول وحیِ واجبُ الاذعان، واجب الیقین ہے (صلی اللہ علیہ وسلّم) یہ بشارتیں سُن رہے ہیں اور دوسری جانب خود اُن کے اُوپر رقت و گریہ ہے انکسار و تواضع ہے عاجزی اور فروتنی ہے یہاں تک کہ فاروق اعظم جیسا اُولوالعزم خلیفہ رض کہتا ہے کاش میں درخت ہوتا۔ کاٹ کر ختم کر دیا جاتا۔ حساب و کتاب کا کوئی قصہ نہ رہتا۔

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جن کے متعلق سیدُ الکونین صلی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں کہ دنیا میں جس کے بھی جتنے احسان تھے سب ادا کر چکا ہوں مگر ابوبکر کے احسانات اتنے ہیں کہ ان کی ادائگی نہیں ہو سکی۔ ان کی ادائیگی اللہ عزّ و جلّ کے سپرد ہے خود ان کی حالت یہ ہے کہ ایک پرندے کو درخت پر دیکھتے ہیں تو رشک کرتے ہیں کہ کاش میں بھی پرندہ ہوتا مسئولیت کی ذمہ داریوں سے محفوظ رہتا۔

یہ متضاد باتیں ایک انسان میں کس طرح جمع ہو سکتی ہیں؟ منطقی طور پر ان متضاد صفات کے اِمکان اور عدم امکان پر بہت سی بحثیں کی جاتی ہیں لیکن جب تک عملی نمونہ سامنے نہ ہو طبیعت کو اطمینان میسر نہیں آسکتا۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا مدنی قدس اللہ سرہ العزیز کی ذات ستودہ صفات ایک عملی نمونہ تھی جس نے کردار و عمل کا نمونہ پیش کر کے بہت سے شکوک رفع اور اس قسم کی منطقی بحثوں کا خاتمہ کر دیا۔

ایک طرف یہ شرف اور فضیلت کہ ظاہری اور باطنی فیوض کا دریا ہر وقت مصروف تلاطم ہے۔ درس حدیث ہے تو ایک ایک وقت میں سیکڑوں مستفیض ہو رہے ہیں اور حلقۂ بیعت و ارشاد ہے تو ایک ایک مرتبہ میں سیکڑوں آپ کا دامن سنبھال کر مرید ہو رہے

ہیں اور ذکر اللہ کے طریقے معلوم کر رہے ہیں۔

سیاسی اور اجتماعی سلسلے میں علمائے ہند آپ کو اپنا صدر اور امیر تسلیم کرتے ہیں تو روحانیت و اخلاقیات کے سلسلے میں تمام اہلِ تقویٰ و طہارت آپ کو مرشدِ کامل اور قطبِ وقت یقین کرتے ہیں۔ اسی قسم کے غیر معمولی اور بے شمار فیوض اوصاف وکمالات کی بنا پر بشارت دی جا رہی ہے کہ (آپ کو امامِ زماں اور افسرِ حج بنایا جائے گا)

(نقش حیات ص۱۰۹)

لیکن اس کے ساتھ وہ تواضع اور انکسار جس کی مثال آج کی دنیا میں تلاش کرنے پر بھی نہیں مل سکتی جو کبھی آپ کو چھوٹوں سے چھوٹے انسانوں کی خدمت پر آمادہ کر دیتی ہے اور کبھی آپ کی زبان سے اس کا اظہار کراتی ہے کہ وحید اور اسعد[1] کے سوا میں کسی کو اپنے سے چھوٹا نہیں سمجھتا اگر آپ کی تعریف میں آپ کے سامنے کوئی جملہ کہہ دیا جاتا ہے تو فوراً پیشانی پر شکنیں پڑ جاتی ہیں چہرۂ مبارک کا رنگ بدل جاتا ہے اور بسا اوقات ایک عامی جملے کے ساتھ ارشاد ہوتا ہے "مٹی کے مادھو" کو تم خواہ مخواہ سر چڑھاتے ہو۔ غرض یہ غیر معمولی تواضع وانکسار، غیر معمولی نمونہ ہے اخلاق و اوصاف صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا۔ ایک تفسیر ہے آیات اخلاق کی، اور ایک تصویر ہے سنّتِ نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی۔ (رحمہ اللہ قدس سرہ العزیز)

(روزانہ الجمعیۃ دہلی ۴ر مئی ۱۹۵۸ء)

---

[1] وحید احمد حضرت شیخ الاسلام کے بھتیجے تھے اور مولانا سید اسعد مدنی حضرت کے صاحبزادہ منظلہم

آفتاب شریعت و طریقت کا غروب

مولانا سیاح الدین کاکا خیل

شد ماتم حسین کنوں تازہ در جہاں — سادات گشتہ اند مصیبت نشینِ ہند
نیلی است زیں معاملہ پیراہن عرب — در خون گریہ سُرخ شد است آستینِ ہند
گیتی چرا سیاہ نہ گردد ز دُودِ غم — خاموش شد چراغ نشاط آفرینِ ہند
ہند ایں چنیں مصیبتِ عظمیٰ نہ دیدہ است — دیدیم داستانِ شہور و سنینِ ہند
از داغِ دل دو ند چراغان اشک جوش — این است نو بہار گل آتشینِ ہند
ماہی دُر آب می طپید و مرغ در ہوا — از شیون امیر جبینِ ہند
ہند از وفاتِ او تن بے روح گشتہ است — یعنی کہ بود او نفسِ واپسینِ ہند

۵ر دسمبر روز پنجشنبہ کو قبل از نماز عشاء جامع مسجد لائل پور (فیصل آباد) میں ایک تبلیغی اجتماع تھا اور حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدیر "الفرقان" لکھنو نے مسلمانوں سے خطاب فرمایا عشاء کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد قریباً پونے آٹھ بجے مقامی روزنامہ عوام کے دفتر سے ایک رپورٹر نے آکر اطلاع دی کہ ابھی ابھی انڈیا ریڈیو سے یہ خبر نشر کی گئی ہے کہ آج سہ پہر کو حضرت مولانا حسین احمد مدنی کا انتقال ہو گیا۔

حیات مستعار کا کیا اعتبار، کسی کی رحلت کا حادثہ غیر متوقع تو نہیں ہوتا اور پھر حضرت شیخ کی عرصۂ دراز کی علالت، پیرانہ سالی اور ضعف و نقاہت، کے ہوتے ہوئے تو اور بھی نظر بہ بظاہر غیر متوقع خبر نہ تھی مگر ہوا یہ کہ خبر سننے کے بعد قلب نے قبول کرنے سے بار بار انکار کیا

سابق مدرس دارالعلوم دیوبند، صدر المدرسین مدرسہ اشاعت العلوم، جامع مسجد لائل پور (فیصل آباد پاکستان)

اور تکذیب کے لیے اس کی مختلف توجیہیں کرنے لگا شاید کران سے سننے اور سمجھنے میں غلطی ہوئی ہو کسی اور سلسلے میں حضرت کا نام آیا ہوگا۔ انھوں نے کچھ اور سمجھا ہوگا۔

گراس شخص نے بڑے وثوق کے ساتھ کہا کہ خواہ آپ کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے اور آپ کا دل گوارا کرے یا نہ کرے، لیکن یہ حادثہ تو پیش آگیا ہے اور میں یہی بھی سُن کراور یہ یقین حاصل کرکے آپ کے پاس آیا ہوں اور میرا مقصد یہ ہے کہ آپ مجھے حضرت مدنی کے مختصر سے حالاتِ زندگی مرتب کرکے ابھی دے دیں تاکہ اس خبر کے ساتھ ہی ہم اخبار میں شائع کردیں۔ اتنے میں پاکستان ریڈیو سننے والوں نے اگرچہ اس کی تصدیق کی اور قلب جس واقعہ کو تسلیم کرنے کے لیے کسی طرح آمادہ نہ ہوتا تھا آخر کار اُسے مانے بغیر اس کو چارہ نہ رہا۔

ریڈیو کی برقی لہروں کے ذریعہ آئی ہوئی اس غم انگیز اور روح فرسا خبر نے بس اسی وقت دل و دماغ، حواس وجذبات اور سکون واطمینان کے خرمن پر ایک برقِ سوزاں گرادی اور اس نے سب کچھ بھسم کردیا۔ اس وقت زمین پاؤں تلے سے نکلنے لگی اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاگیا، کان بجنے لگے اور آنسوؤں کی لڑیاں رخساروں پر بہنے لگیں۔

اس سانحۂ ہوش ربا کی وحشت انگیز خبر سنتے ہی تمام مجمع حواس باختہ ہوگیا۔ لوگ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور چیخیں مار مار کر اور بے قابو ہو کر آنسو بہانے لگے۔ بعض اس رنج وغم کے پہاڑ گرنے سے بیخود و بے ہوش ہوگئے اور مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگے اور پوری کی پوری محفل پر کرب و بے چینی اور پریشان حالی کی ایک خاص کیفیت چھاگئی۔

یوں تو کہا جاسکتا ہے کہ اس دنیا میں ہر آنے والا ایک نہ ایک دن جاتے ہی کے لیے آتا ہے دنیا کی اس سرائے میں مسافروں کی آمد ورفت کا سلسلہ جاری ہے اور تا قیامت جاری رہے گا مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ تمام انسانوں کی موت برابر نہیں ہوتی۔ کسی کی جدائی اپنے عزیز واقارب اور خاندان کے لیے موجب رنج اور باعثِ پریشانی ہوتی ہے اور کسی کی مفارقت ایک قبیلے ایک خاص گروہ یا محدود سی آبادی کے لیے صدمے اور اضطراب کا موجب ہوتی ہے، لیکن انسانوں ہی میں سے بعض ہستیاں ایسی ہوتی ہیں کہ جب وہ اس عالمِ ناسوت سے عالمِ لاہوت کی طرف رختِ سفر باندھ کر چلتی ہیں اور اس مد شاہراہ پر۔۔ رہگراے عالم جاودانی ہوتی ہیں تو وہ خود اگرچہ اس دار ابتلا ومحن سے دارالنعیم کی طرف خنداں خنداں جاتی ہیں لیکن ان کی اس دائمی مفارقت سے لاکھوں اور کروڑوں کی آنکھیں گریہ کناں ہوتی ہیں اور ایک قوم کیا بلکہ کئی

قوموں کی دنیا اجڑ جاتی ہے اور بھری محفلیں آن کی آن میں سُونی ہو جاتی ہیں۔ چار دانگ عالم میں ایک اندھیرا چھا جاتا ہے اور سیکڑوں ہزاروں کی تعداد میں لوگ فرطِ غم سے مدہوش ہو کر تڑپنے لگتے ہیں۔

حضرت شیخ الاسلام کی رحلت کا یہ حادثہ بھی عام اِنسانوں کی رحلت کے حادثے کی طرح کا نہیں تھا۔ ہمارے زمانے سے پہلے جو اکابر اور اساطینِ اُمّت دنیا سے تشریف لے گئے ہیں ان کے بارے میں اب ہم اپنے تاثرات کیا بیان کر سکتے ہیں، لیکن خود ہماری آنکھوں کے سامنے اس موجودہ دور کے منتخب روزگار علمائے کرام اور رہنمایانِ قوم نے اس سرائے فانی سے عالم باقی کی طرف انتقال فرمایا اور ان کی جُدائی اور ان کے فیوض و برکات سے محرومی کا رنج و غم ہم نے محسوس کیا اور پیہم صدمات سے قلوب زخمی ہوتے گئے مگر جب حضرت شیخ مدنی موجود تھے تو دلوں کو ایک ڈھارس تھی کہ رشد و ہدایت کا ایک چراغ تو روشن ہے اور ایک ایسی ہستی مرکزِ علوم دینیہ دارالعلوم دیوبند کی مسندِ صدارت پر جلوہ افروز ہے جو امت کے لیے عقیدت کی تکیہ گاہ اور اس دورِ ظلمات میں امید کی کرن کا حکم رکھتی ہے، لیکن آج ہماری بدقسمتی سے اُمت کی یہ متاعِ گراں مایہ بھی امت کے ہاتھوں سے ملاءِ اعلیٰ میں چلی گئی اور ہم ان کے سایۂ عاطفت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئے۔ عربی زبان کا ایک مشہور و معروف اور مبتذل شعر ہے لیکن کلام موزوں میں اس سے بڑھ کر مناسب و موزوں کلام حافظ میں فی الحال مستحضر نہیں جو حقیقت حال کی پوری تعبیر کر سکے اس لیے وہی دہرانا پڑتا ہے کہ

فما کان قیس ہلکہ ہلک واحد ولکنہ بنیان قوم تہدما

قیس بن عاصم کے بارے میں شاعر نے مبالغہ سے کام لیا ہو تو لیا ہو، حضرت شیخ مدنی کے بارے میں یہ ہرگز مبالغہ نہیں، بلکہ واقعے کی صحیح تعبیر ہے اور قوم سے مراد بھی صرف علما کی جماعت نہیں، صرف مریدین و مسترشدین کا گروہ نہیں، صرف دیوبندی مسلک والے مسلمان نہیں، صرف ہندوستان کے رہنے والے مسلمان نہیں بلکہ درحقیقت دنیائے اسلام کی پوری مسلمان قوم مراد ہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ اس سانحۂ عظمیٰ سے پوری مسلمان قوم کی بنیادیں متزلزل ہو گئی ہیں اور مسلم قوم کا قصرِ رفیع گر گر پیوندِ زمین ہونے لگا ہے حضرت مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی مدظلہ نے بالکل صحیح فرمایا ہے:

"ایک ایسی جامع صفات، مقدس، انوار و برکات کی حامل شخصیت کا ہم سے رخصت

ہو جانا شاید اس صدی کا سب سے بڑا سانحہ اور ناقابل تلافی نقصان ہے۔ کسی ایک انسان کی موت سے اس کے بچے یتیم، اس کی بیوی بیوہ اور اس کے عزیز غمزدہ ہوتے ہیں مگر آج وہ عظیم شخصیت ہم سے جدا ہوئی ہے کہ کوئی ایک گھرانا، ایک کنبہ اور خاندان نہیں پورا عالم اسلام دانسانیت یتیم و بے سہارہ ہو کر رہ گیا۔"

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہ العزیز محض اس دور کے جید اور متبحر عالم دین اور اسرار شریعت کے ماہر اور مسندِ رشد و ہدایت کے صدر نشین مرشد و ہادی نہ تھے، بلکہ وہ حقیقی معنوں میں سلف صالحین کی یادگار تھے۔" یہ چراغ محمدؐ محفلِ دوخین کا چراغ سحر تھا جو قریباً ۸۱ سال جل کر اور اس تیرہ و تار عالم کو روشن رکھ کر بالآخر ۱۲ رجمادی الاول ۱۳۷۷ھ مطابق ۵ دسمبر ۱۹۵۷ء کو ہمیشہ کے لیے بجھ گیا۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ اور دوسرے اکابر اساتذہ کے علوم و معارف کے خزانوں کے آپ ہی اس موجودہ عصر میں امین تھے۔ آپ ہی کی ذات میں حضرات چشتؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت سید احمد شہید بریلویؒ کی نسبتیں یک جا تھیں آپ کا سینہ چشتی ذوق و شوق اور مجددی سکون و محبت کا مجمع البحرین تھا اور آپ کی زبان شریعت و طریقت کی وحدت کی ترجمان تھی آپ کے فیض نے تقریباً نصف صدی تک اللہ تعالیٰ کے فضل و توفیق سے اپنی تعلیم و تربیت اور تزکیہ و ہدایت سے ایک عالم کو مستفید بنا رکھا تھا اور صرف ہندو پاکستان میں نہیں بلکہ تمام دنیائے اسلام میں اسلامی تعلیمات کی روشنی ان کی زبان فیض ترجمان اور تعلیم و تدریس کے واسطے سے پھیلی۔ دارالعلوم دیوبند کے دارالحدیث میں بیٹھ کر اس آفتابِ علم و عرفان نے علوم و معارفِ حدیث رسول اللہ ﷺ کی روشنی مشرق و مغرب تک پھیلا دی اور اس بحرِ رشد و ہدایت نے اپنے فیض عمیم سے ہر خاص و عام اور قریب و بعید کو سیراب و شاداب کر دیا۔

اسی لیے زبانِ خلق نے اسے شیخ الاسلام کہہ کر پکارا اور حقیقت یہ ہے کہ اس شیخ وقت کے لیے یہ خطاب حقیقت تھا۔ ایسے جامع الصفات اور بہر وصف و کمال میں درجۂ کمال پر بزرگ بڑی مشکل سے کہیں عالم وجود میں آتے ہیں۔ علم و فضل کے انتہائی بلند مدارج پر فائز ہونے کے ساتھ ساتھ اسی درجے میں عمل کے میدان کا شہسوار بہت ہی کم ملتا ہے، لیکن یہاں حالت یہ تھی کہ علمی کمالات و فضائل کے اعتبار سے اپنے دور میں عدیم النظیر اور فقید المثال ہونے

کے ساتھ ہی عمل میں بھی یکتا اور سراپا عمل تھے ۔ شفقت و رحمت، حلم و تواضع، ایثار و قربانی عفو و کرم، جود و سخا خدمت و مدارات، مہمان نوازی و غربا پروری اور اس قسم کے دوسرے مکارم اخلاق کا ویسے تو نام سنا جاتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان فضائل اور محاسنِ اخلاق کو اگر عملی صورت میں کوئی دیکھنا چاہتا تو اس کی یہی شکل تھی کہ حضرت مدنی کی ملاقات سے بہرہ ور ہو کر اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر کے یقین حاصل کرتا۔ اس لیے آج پاکستان و ہندوستان کے گوشے گوشے میں ہر شہر اور ہر قصبے میں، ہر مدرسے اور ہر کالج میں، ہر مسجد اور ہر خانقاہ میں، ہر دینی اور ہر سیاسی جماعت کے دفتر میں صرف ایک عالم کی وفات کے صدمے پر رونا نہیں بلکہ آج علم و عمل، شفقت و رحمت، شجاعت، و جرأت جود و سخاوت، حلم و عفو، ایثار و قربانی، تواضع و فروتنی، خدمت گذاری و انکساری مہمان نوازی و مسافر پروری، اور اسی طرح دوسرے اخلاقِ فاضلہ کی ایک نمایاں شہرۂ آفاق مثالی ہستی کی مفارقت کا صدمہ ہر کسی کو خون کے آنسو رُلا رہا ہے۔ لوگوں کو یاد آتا ہے کہ اس مجاہد اعظم نے ہندوستان کی آزادی اور انگریزوں کے پنجۂ جور و استبداد سے ملک و قوم کو چھڑانے کے لیے کس قدر عظیم کارنامے سرانجام دیے ہیں۔ مالٹا کی اسارت، کراچی کی عدالت میں مجاہدانہ نعرۂ حق اور پھر قید و بند کی صعوبت پھر اس کے بعد استخلاصِ وطن کی خاطر بار بار جیل میں سنتِ یوسفی کو تازہ کرنا اور مسلسل اس میدان میں معروفِ جہاد رہنا، اور تقسیم ملک کے بعد ہندوستان کے خوفزدہ اور اکھڑ جانے والے مسلمانوں کو جمانے کے لیے شب و روز کی انتھک کوشش اور مخاطر و مہالک میں بہادرانہ گھس جانا، یہ سب باتیں جب یاد آتی ہیں تو اس کے ساتھ اس پیکرِ عزم و استقلال کی عظیم شخصیت سامنے آتی ہے اور پھر ایسی شخصیت کی دائمی جدائی کا احساس ہوتا ہے تو دل بے قابو ہو کر لرزنے لگتے ہیں اور قلبی اضطراب کی لہریں اُٹھ اُٹھ کر آنکھوں سے رنج و غم کے آنسو بہا دیتی ہیں۔

جاننے والے جانتے ہیں کہ دنیائے اسلام کا یہ مخدوم اپنے مہمانوں کے پاؤں دبانے کے لیے رات کی خاموشیوں میں بیدار رہتا تھا اور خواہ کوئی اپنا آشنا یا بیگانہ، اس کا دسترخوانِ جود و کرم ہمیشہ ہر کسی کے لیے فراخ و کشادہ رہا اور پھر ایسا درویش غنی دل تھا کہ اس بذل و کرم اور جود و سخا میں بھی عجز و انکسار کا انداز نمایاں تھا۔ آپ کا دن علوم و معارف کی خدمت و اشاعت سے اور راتیں ذکر و خشیتِ الٰہی سے پُر نور رہتی تھیں۔ جب یہ جاننے والے آج حضرت کی ان اداؤں کو یاد کرتے ہیں تو پھر بے اختیار روتے روتے اُن کی ہچکیاں بندھ جاتی ہیں۔

اس ملک اور دور میں مدارس وجوامع میں بہت سے جید عالم اور مدرس بھی موجود ہیں اور خانقاہوں میں مختلف سلسلوں کے اصحاب ارشاد اور اہل طریقت ومعرفت بزرگ بھی ہیں مصنف ومؤلف بھی ہیں اور واعظ وخطیب بھی، مذہبی رہنما بھی ہیں اور سیاسی لیڈر بھی ہر ایک اپنے اپنے رنگ میں اور اپنے اپنے انداز سے دین کی خدمت بھی کر رہے ہیں۔ مگر اس دور میں جامع شخصیت حضرت الشیخ ہی کی تھی۔ وہ مدرس ومعلم ہی نہیں؛ صدر المدرسین وفخر المعلمین بھی تھے اور چاروں سلاسلِ طیبہ کے مجاز طریقت اور خانقاہِ رشیدی کے اسرارِ رشد وہدایت کے امین اور لاکھوں کی تربیت وتزکیہ کرنے والے مرشد اعظم بھی، تصنیف وتالیف کے میدان میں بھی حسب ضرورت کام کیا اور وعظ وخطاب کے ذریعے بھی درۂ خیبر کے پہاڑوں سے لے کر برما وآسام تک حق کا پیغام پہنچا دیا تھا۔ مذہبی قیادت وسیادت کے اعتبار سے بھی شیخ الکل اور سید السادات تھے اور سنہ ۱۹۴۰ء سے لے کر اب تک متواتر سترہ سال جمعیت علمائے ہند کی صدارت کی اور اس سے قبل بھی عملاً آپ ہی صدرِ جمعیت اور امیر جماعت تھے اور آپ ہی کی رہنمائی میں تمام علمائے کرام کا قافلہ رواں دواں رہا۔ اور سیاسی لیڈر بھی آپ تھے اور ملک کی آزادی کے سلسلے میں ہر لیڈر سے بڑھ کر آپ نے حصہ لیا اور ایک جرنیل کی طرح کام کیا بس یہی جامعیت حضرت کی وہ خصوصیت ہے جس کی نظیر اس دور میں نہیں مل سکتی اور سابقہ زمانوں میں بھی شاید مشکل سے ملے گی۔

ایک ہاتھ میں جام شریعت اور دوسرے ہاتھ میں سندانِ عشق لے کر جام وسنداں باختن" کا عملی نمونہ آپ ہی تھے۔ یہ ایک خصوصی کمال اور موہبتِ الٰہی ہے اور آپکا وجود ؎

لیس علی اللّٰہ بمستنکر　　ان یجمع العالم فی الواحد

کی زندہ مثال تھی اور بقول مولانا بنوری زید مجدہٗ آپ اس دور میں "آیۃ من آیات اللہ" تھے۔ اور اس لیے جب تک یہ نعمت ہم میں موجود تھی ہم ہر دوسرے سے مستغنی تھے۔

سکوتٌ بہٖ عن کل من کان قبلہٗ

اور آج جب ہم اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم ہو گئے تو ؎

چہ گنم کہ چشم بدیں نہ کند بہ کس نگاہے

کا معاملہ درپیش ہے اور ہم پر ایک مایوسی کی کیفیت طاری ہو رہی ہے اور کسی اور پر نگاہیں جمتی نہیں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ کون اس خلا کو پُر کر سکے گا۔

دَاذُھَلَنِی عَنْ کُلِّ مَنْ ھُوَ تَابِعُہٗ

یوں تو ہم میں سے ہر ایک آج اپنے اپنے ادراک اور احاطۂ علم کے مطابق حضرت شیخ کے فضائل و مناقب اور کمالات و اوصاف بیان کر رہا ہے اور یاد کر کے رو رہا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ کی اصل وجہ فضیلت اور امتیازی وصفِ کمال کی تعبیر پھر بھی نہیں کی جا سکتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس چیز نے حضرت شیخ کو اپنے زمانے کے تمام علما و مشائخ، محدثین و مفسرین، مدرسین و مصنفین، خطبا و رہنمایانِ ملک و ملت سے ممتاز اور افضل بنا دیا تھا اور جس کی وجہ سے زندگی میں ہزاروں علما و فضلا اور مشائخ و صوفیہ آپ پر جان چھڑکتے، اپنے آپ کو قربان کرتے اور آنکھیں بچھاتے تھے اور اب رحلت کے بعد جس چیز کے ہاتھ سے چلے جانے کی وجہ سے دل لرز رہے، ہاتھ کانپتے اور آنکھیں آنسو بہا رہی ہیں وہ کچھ حضرت کی بعض ایسی ادائیں تھیں جن کی صحیح تعبیر و توضیح الفاظ میں کوئی بھی نہیں کر سکتا لیکن اس کا ادراک سب کرتے تھے۔ جس سے متاثر سب ہوتے تھے اور جس کو محسوس کرنے کے بعد بے اختیار علمی غرور والوں کی گردنیں بھی جھک جاتی تھیں اور مشیخت کے دعوے بھی ماند پڑ جاتے تھے۔ اور خاندانی اور نسبی تفاخر کی باتیں بھی ختم ہو جاتی تھیں اور ہر کسی کو طوعاً و کرہاً یہ اقرار کرنا پڑتا تھا کہ ؎

آفاقہا گردیدہ ام مہرِ بتاں ورزیدہ ام بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

حضرت کی ان خصوصی اداؤں نے ایک عالم کو شکار کر لیا تھا اور انھی کی وجہ سے کتنے ہی سرکش اور بھڑکنے والے آخر کار دامِ عقیدت و محبت میں گرفتار ہو جاتے تھے۔ اور منصف مزاج دشمنوں اور مخالفوں کو بھی اقرار کرنا پڑتا اور وہ سپر ڈال دیتے تھے اور یہ "بے نام ادائیں" ہی ہوتی ہیں جو کسی ذات کے لیے خصوصی طور سے وجہِ محبوبیت و مقبولیت بن جاتی ہیں کسی نے بالکل سچ کہا ہے کہ ؎

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

حضرت شیخ اپنے اسلاف کی ایک ایسی یادگار تھے، جن کے ذریعے سے اُن حضرات کی روایات زندہ تھیں اور حضرت کی ذات ایک ایسا آئینہ تھا جس میں ان اکابر سلف کے حسنِ اخلاق اور حسنِ اعمال اور فضائل و کمالات کی جلوہ آرائی نظر آ رہی تھی لیکن اس پر بھی تواضع اور عجز و انکسار کا یہ عالم تھا کہ محض تکلفاً اور تصنعاً نہیں بلکہ حقیقۃً اپنے آپ کو "ننگِ اسلاف" سمجھتے اور کہتے رہے۔ اپنے کو ننگِ اسلاف، سمجھا جبھی تو فخرِ اسلاف اور وارثِ اسلاف کہلائے۔

اپنے روحانی مربیوں اور اساتذہ کے ساتھ عقیدت و محبت اور پھر خدمت گزاری کا جو تعلق حضرت نے قائم کیا تھا دوسرا کوئی مسترشد و شاگرد ایسا قائم نہیں کر سکتا حضرت شیخ مدنی، شیخ الہندؒ پر جان قربان کر چکے تھے اور اس کے عملی نمونے دنیا کو دکھا دیے تھے اور اسی کا اثر تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ کا پورا رنگ پختہ طور سے آپ پر چڑھ چکا تھا اور اس لیے دنیا خود بخود اس پر مجبور ہوئی کہ آپ کو جانشین شیخ الہند قرار دے اور حق یہ ہے کہ شیخ الہند کے اس جاں نثار خادم اور تلمیذِ رشید نے اپنے مخدوم اور استاد کی جانشینی کا حق ادا کر دیا۔ جس راستے پر حضرت الاستاذ چل رہے تھے اور تلامذہ کو چلانا چاہتے تھے، یہ سعادت مند شاگرد آخری دم تک اسی راستے پر چلتے رہے اور لاکھوں کو اسی راستے پر اپنی قیادت میں گامزن کر دیا۔ انگریز کے ساتھ قلبی بغض و عداوت اور اس منحوس قوم سے نفرت و بیزاری اور اس کے مقابلے کے لیے ننگی تلوار بن کر میدان میں نکلنا یہ حضرت شیخ الہندؒ کا خصوصی جذبہ تھا اور حضرت مدنی نے استاد کے اس جذبے کو بہ درجۂ کمال اپنے قلب کی کیفیت بنا دیا تھا اور انگریز کی عداوت آپ کی رگ رگ میں سما گئی تھی۔ اس موقع پر مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی ایک عبارت یاد آ گئی۔ آج سے قریباً ۲۹ سال پہلے مولانا دریا آبادی نے اپنے سفرِ حج کے سلسلے میں اپنے سفرنامۂ حجاز میں شیخ سنوسیؒ سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ طرابلس کے اس مجاہدِ اعظم کی زیارت کے ساتھ لازماً ہندوستان کے مجاہدِ کبیر شیخ مدنی کی یاد آتی ہے سلوک بہ طریقت نبوت کی مثالیں دیتے دیتے لکھتے ہیں:

"حضرت شیخ الہند دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کا جہاد اور ذوقِ شہادت تو موجودہ نسل کی آنکھوں دیکھی بات ہے۔ اسے کون بھول سکتا ہے۔ اسے کیوں کر بھلایا جا سکتا ہے اور پھر شیخ الہند کے بعد آج بھی خدائے حیّ و قیوم کے فضل و کرم سے ایک زندہ سلامت ذات، ہند اور اہلِ ہند کے درمیان موجود ہے جو اسے دیکھ اور پہچان چکے وہ اپنی آنکھوں کو مبارک باد دیں اور جنھوں نے نہیں دیکھا اور نہیں پہچانا انھیں دکھانے اور پہنچانے کی اجازت" (نامہ حجاز ص ۳۵۹) ہائے افسوس کہ وہ زندہ و سلامت ذات آج ہمارے درمیان سے رخصت ہو کر اور اپنے رب کے ہاں پہنچ کر زندۂ جاوید ہو گئی اور اب ہند اور اہلِ ہند کے درمیان موجود ہونے کے بجائے اعلیٰ علیین میں ارواحِ طیبہ اور "عباد اللہ" کے زمرے میں تشریف فرما ہے اور شیخ الہندؒ کا یہ جانشین اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کا یہ عقیدت کیش خادم آج مولانا نانوتوی کے قدموں میں اور حضرت شیخ الہندؒ کے پہلو میں آرام فرما ہو گیا ہے قدس اللہ اسرارہ و افاض علینا انوارہ و رحمہ رحمۃ

واسعۃ کاملۃ۔

الغرض کیا کیا لکھا جائے اور کہاں تک لکھا جائے یوں تو رنج و غم کے خمار سے قلم مست وبے ہوش ہے اسے لکھنے کے لیے کھلا چھوڑ دیا جائے تو بہت کچھ لکھ سکتا ہے۔ لکھتا ہی رہے گا۔ اور اسے یہ ہوش ہی نہیں کہ اس حکایتِ ہجر و فراق اور "ماتم حسین" میں اس نے کاغذ کے کتنے صفحوں کو سیاہ کر کے لباس ماتم پہنا دیا۔ لکھنے والے کا ہاتھ بھی قلب کی وارفتگی کی وجہ سے از خود رفتہ ہے اور وہ غم واندوہ کے بیابان میں "مشق نام لیلیٰ" سے اپنی خاطرِ فاتر کو تسلی دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن جذبات پر قابو پانا اور کیفیاتِ قلبی کو اعتدال میں رکھنا عقل و شرع کا فیصلہ اور حکم ہے۔ اس لیے جب کہ۔۔۔ تقدیرِ الٰہی اور فیصلہ لوح محفوظ کی بنا پر یہ حادثہ رونما ہو چکا اور اس نعمتِ عظمیٰ سے متمتع ہونے کا وقت ختم ہوا اور کُلُّ شَیءٍ عِندَہٗ بِمِقدَارٍ کے مطابق اس سے انتفاع و استمتاع کی مدت پوری ہو گئی اور لِلّٰہِ مَا اَخَذَ وَلَہٗ مَا اعطٰی کے ارشاد نبوی کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اپنا ہی عطیہ اب اپنے بندوں سے لے لیا اور اپنے دوست کو اپنے ہاں بُلا لیا۔ تو اب جزع و فزع کے بجائے صبر و استقامت، ثبات و استقلال اور دعا گوئی کی ضرورت ہے۔

پروردگار عالم اس مجاہدِ جلیل کی روحِ مطہر پر اپنی بے پایاں رحمتوں کی بارش فرمائے اور اعلیٰ علیین میں اعلیٰ ترین مراتب و درجات سے سرفراز فرمائے اور اُن کے اُس مرقدِ مبارک کو جو اُن جیسے مقدس و پاکیزہ بزرگوں کے جوار میں واقع ہے پُر نور فرمائے اور اس مصیبت عظمیٰ سے متاثر تمام افراد خاندان، طلبۂ علوم دینیہ اور علمائے کرام، تمام مسترشدین و متعلقین اور تمام مسلمانوں کو صبر جمیل اور استقلال و استقامت کی نعمت سے نوازے۔ آمین

نوٹ۔ یہ مضمون رسالہ شمس الاسلام بھیرہ میں شائع ہوا ہے میں نے اس کو مولانا سیاح الدین صاحب کے خط سے نقل کیا ہے۔ (افضال الٰہی دیوبندی)

مدنی نظام تبلیغ و تربیت

مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی

تبلیغ و تربیت کا ہمیشہ وہی طریقہ کامیاب ہوا ہے جو دل کی گہرائیوں میں اثر انداز ہوا اگر کسی مربی مبلغ کی شخصیت کسی خوش نصیب کے دل میں گھر کر گئی تو بس وہ کامران ہو گیا دوسرے طریقے اور ذرائع وقتی طور پر خواہ کتنے ہی کامیاب معلوم ہوں، مگر دراصل وہ کامیاب نہیں ہوتے اور ان کا اثر فوری اور سریع الزوال ہوا کرتا ہے اس میں مبلغ اور مربی کی شخصیت اس کا ذاتی کیرکٹر خلوت و جلوت کی یکسانیت ظاہر و باطن کی برابری کا بڑا دخل ہوتا ہے۔

مبلغ اعظم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کا تعارف اور پھر اس کا اثر قرآن کریم میں یوں ارشاد ہوا ہے:

(ترجمہ) "بعد اس کے خدا ہی کی رحمت سے آپ ان کے ساتھ نرم رہے اور اگر آپ تند خو سخت طبیعت ہوتے تو یہ آپ کے پاس سے سب منتشر ہو جاتے۔"

ارشاد اوّل میں آپ کا تعارف یوں کرایا گیا کہ آپ چوں کہ رحمت الٰہی کا پرتو اور مظہر ہیں آپ اسم رحمٰن و رحیم عز اسمہٗ کی تجلی کامل ہیں اس لیے آپ کا ان اوّلین مخاطبین کے لیے نرم ہونا شفیق و مہربان ہو جانا لازمی ہے اسی تعارف کو دوسری جگہ یوں ارشاد فرمایا:

(ترجمہ) "اور ایمان والوں پر شفیق و مہربان ہیں اور ہم نے تو آپ کو لوگوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے"

اس رحمت کا اثر کیا ہوا اس کو دوسرے ارشاد میں فرمایا کہ اسی کا اثر ہے یہ لوگ پروانہ وار آپ کے اردگرد جمع ہو رہے ہیں آپ کا ناخن، بال، پسینہ تو ان کے ہاں مبارک ہے ہی آپ کا تھوک تک زمین پر نہیں گرنے دیتے بلکہ عبداللہ بن زبیر جیسے بھی موجود ہیں جو فصد کا خون تک، پی جاتے ہیں۔

کیمبل پور ضلع پشاور، صوبہ سرحد (پاکستان)

چوں کہ ہمارے اسلاف رحمہم اللہ تعالیٰ کا سلوک بھی سلوک نبوّت ہے یعنی ان بزرگوں نے اپنے متبعین کو سنّت کا عامل بنایا کرامت کا صدور، کشف کا اجرا، مریدین کا رجوع، فتوحات کا ہوجانا ہمارے اکابر کے ہاں معیار کامیابی نہیں، بلکہ ان کے ہاں تو اتباعِ سنّت کا ملکہ راسخہ پیدا ہوجانا ہی سب سے بڑی کرامت اور کامیابی ہے۔ اس لیے یہ امتِ وَسَطاً کی مصداق جماعت ہمیشہ کے لیے ان امور سے ارادی اور غیر ارادی طور پر مجتنب رہی ہے جن سے کسی طالبِ ہدایت کے رجوع کا جذبہ پیدا ہوسکے بلکہ ہمارے شیخ نوراللہ مرقدہٗ نے چند سال پہلے بیعت طریقت کے لیے کڑی اور سخت شروط لگا رکھی تھیں۔

میرا اپنا واقعہ ہے کہ دورۂ حدیث میں شرکت کی سعادت پر مشرف ہوا تو دل کی بیقراری اور ضمیر کی بے چینی بڑھنے پر اشتیاق بے انتہا کے ساتھ حلقۂ ارادت میں شرکت کی درخواست کی مگر نامنظور کردی گئی، فراغت پر دوبارہ درخواست کی مگر وہ بھی نامنظور، کئی بار دیوبند کا سفر اسی لیے کیا مگر نامنظور آخر بے حد اصرار کے بعد استخارۂ مسنونہ کا حکم فرمایا چناں چہ احقر نے تعمیلاً جب استخارہ کیا تو یہ دیکھا کہ:

حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ راندیر کے قریب ایک قصبہ گلہ کی جامع مسجد میں بنے ہوئے حوض کی سطح پر نماز باجماعت پڑھا رہے ہیں اور میں اُسی حوض پر بیٹھا وضو کر رہا ہوں وضو میں عمداً تاخیر ہورہی ہے اتنے میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم تشریف لائے اور ارشاد فرمایا یہ کیسے نادان لوگ ہیں جو میری موجودگی میں کسی ولی کا اتباع نہیں کرتے۔

چناں چہ جب اس سال حاضر ہوا اور یہ بشارت پیش کی تو حلقۂ ارادت میں قبول فرما کر مفتخر فرمایا۔

(فائدہ) قصبہ گلہ بھڑوچ کے نواح میں واقع ہے یہ وہی جگہ ہے جہاں حضرت عمر فاروق کے زمانۂ اقدس میں اسلامی فوج پہنچ چکی تھی۔

(۱) سطح آب پر لکڑی کے تخت کا ہونا اس امر کی دلیل معلوم ہوتی ہے کہ پانی ہی اصل تخلیق ہے۔ (ترجمہ) ہم نے ہر چیز کو پانی سے پیدا کیا۔ اور سالک کے لیے عبور ماء بلند مقام ہے اس لیے کہ عرشِ الٰہی بھی کائنات ارضی کی تخلیق سے پہلے پانی پر تھا۔ وَکَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ ترجمہ: اس کا عرش پانی پر تھا۔ اس لیے ہمارے شیخ نوراللہ مرقدہٗ نے ہمیشہ اس امر سے اجتناب کیا کہ کوئی آدمی کسی کے اثر سے یا حسن بیان یا عقیدہ کے جذبے سے متاثر ہوکر تربیت میں آئے۔

مولانا عبدالماجد دریا آبادی جیسے بالغ النظر مشہور و معروف بزرگ کی بیعت کا ذکر خود موصوف نے اپنی کتاب "نقوش و تاثرات" میں کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے :

آپ کو مولانا محمد علی مرحوم لے کر دیوبند حاضر ہوئے۔ مگر حضرت نے یہ فرماتے ہوئے "یہاں کیا رکھا ہے تھانہ بھون چلیے" ان کے ساتھ چل کر حضرت تھانوی قدس سرہ العزیز کی خدمت میں پیش کر دیا۔ حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ آپ کو مجھ پر اعتماد ہے کہ نہیں؟ آپ نے فرمایا جناب پر اعتماد ہے۔ تو حضرت تھانوی نے فرمایا میری شہادت ہے کہ آپ اس امر کے اہل ہیں کہ ان کو بیعت کریں۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت نے کبھی ان وظائف کی اجازت نہیں دی جن سے مقصد تسخیر ہو، یہ بات اکثر لوگوں میں جاری وساری ہے کہ ایسے عملیات اور وظائف اس لیے پڑھے جاتے ہیں کہ لوگوں میں قبولیت اور اثر ہو لوگوں کا رجوع ہو مگر حضرت شیخ کے ہاں یہ بات نہ تھی، آپ سے اگر کسی نے ایسا عمل یا وظیفہ طلب کیا تو آپ نے لطیف انکار فرما دیا جیسا کہ بعض دوستوں کو اجازت حزب البحر جزدی تو وہ ان کی دل جوئی یا محض ایک متبرک دعا کی حیثیت سے دی نہ اس لیے کہ وہ پڑھ کر لوگوں میں مقام اور اثر حاصل کریں۔

اس سیہ کار نے شروع میں اجازت طلب کی تو اجازت عطا فرما دی مگر جب کہ اس کی زکوٰۃ ادا کرنے کا ارادہ کیا تو اسی رات جناب کو دیکھا کہ فرما رہے ہیں۔

نوجوانو! تم کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرنا چاہیے" اس کے بعد میں نے تو چلّہ کا ارادہ ترک کر دیا۔

عوام وخواص کے بے پناہ رجوع پر بجائے اس کے کہ آپ کو دلی خوشی ہوتی الٹا آپ مضطرب نظر آتے ہیں اور یہ اضطراب اس حد تک بڑھا ہوا ہے کہ ارشاد فرمایا:

بار بار دُعا کی اور رو رو کر دُعا کی کہ ان لوگوں کو مجھ سے پھیر دیا جائے میں بالکل تہی دست ہوں اور نالائق اور ناکارۂ حقیقی بالخصوص ننگِ اسلاف ہوں، مگر کیا کروں قبول نہیں ہوتی ؎

یَظُنُّ النَّاسُ بِی خَیْرًا وَّ اِنِّی لَشَرُّ النَّاسِ اِن لَّمْ یَعْفُ عَنِّیْ

(ترجمہ) لوگ میرے بارے میں حسن ظن رکھتے ہیں حالاں کہ میں اگر معاف نہ کیا جاؤں تو سب سے بُرا ہوں۔ (مکتوبات جلد دوم ص ۱۶۰)

اور یہ اس لیے کہ ہمارے اسلاف کے ہاں جس قدر مقاماتِ عالیہ سے سرفرازی ہوتی

ہے اُسی قدر فنائیت کا مقام ملتا ہے ہمارے اسلاف کے یہاں سراسر عبودیت ہی عبودیت ہے انانیت کا تو شائبہ تک موجود نہیں حضرت شیخ نے فرمایا:

حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا اگر آدمی کے قلب سے انانیت (خودبینی) نکل گئی تو نہ قطب بننے کی ضرورت ہے نہ ابدال ہونے کی حاجت اور اگر انانیت و تکبر قلب سے نہیں نکلا تو قطب و ابدال ہونے سے کیا فائدہ (حاشیہ مکتوبات جلد دوم ص۵۲)

یہ انانیت ان اسلاف کرام کے قلوب سے کس طرح نکل چکی تھی اس کا ایک نمونہ قطب الارشاد حضرت گنگوہی کے مکتوبات شریفہ سے پیش ہے:

"اور "میں اور تو" خود شرک ہے استغفر اللہ استغفر اللہ استغفر اللہ لاحول ولاقوۃ الا باللہ"
(مکاتیب رشیدیہ ص۱۰)

اس لیے حضرت شیخ قدس سرہ العزیز کے مکتوبات میں سب سے زیادہ زور ان ہی اصولی باتوں پر دیا گیا کہ کسی کو اپنی طرف عملی قولی یا ارادی طور پر کھینچنے کی کوشش نہ کی جائے، تو اب پھر یہ اس قدر رجوع خلائق اور بے پناہ محبت اور شوق لوگوں میں کیوں پایا جاتا ہے کہ ایک ایک محفل میں چھ چھ ہزار خوش نصیبوں نے بیعت کی سعادت حاصل کی اور دنیا میں پہلی دفعہ کسی شیخ طریقت اور صاحب ارشاد نے بیعت کے الفاظ آلہ کبر الصوت پر پڑھائے ہوں! وہ ننگِ اسلاف لکھنے والے حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز ہی ہیں۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ حضرت کا نظام تبلیغ اور تربیت سراپا عملی تھا حضرت کا اپنا عمل، عقیدہ، اخلاق اور سراپا اطاعت خداوندی میں رنگی ہوئی شخصیت جاذبہ کا صبغۃ اللہ کا صحیح مظہر، خوش نصیبوں کو اس چشمۂ فیض و اخلاص کی طرف کھینچنے والا تھا، آپ کا سارا عمل رضائے الٰہی ساری جدوجہد اتباع نبوی کے لیے تھی جس کا لازمی نتیجہ رجوع خلائق اور آپ کا مقام محبوبیت پر فائز ہونا تھا، آپ کے دل میں حسد، بغض، کینہ، اپنی ذات کے لیے ہرگز موجود نہ تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دفعہ طلبۂ دارالعلوم کے اجتماع میں ان ہی کی کسی خاص چپقلش پر بغرض نصیحت آپ نے فرمایا تھا ؎

مباش در پے آزار و ہرچہ خواہی کن — کہ در شریعتِ ما جزیں گناہے نیست

اس حد تک تواضع اور انکسار اور اخفائے مقامات کے باوجود آپ اس قدر کیوں مرجع خلائق ہوئے اور کیوں اس قدر عوام اور خواص کے قلوب میں آپ نے مقام حاصل کیا، سبب

سے بڑی بات تو یہ ہے ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ اسی فضل الٰہی کے اسباب میں ایک سب سے بڑا سبب اور ذریعہ جو حضرت شیخ کو حاصل تھا وہ اپنے عمل و کردار کی راستی اور بلندی تھی آپ ہمہ تن عمل اور اخلاق عالیہ کا مظہر تھے آپ کی عملی زندگی خود دوسروں کی کشش کا باعث بنی آپ کے عمل نے دوسروں کو اس مقدس کوچہ کی خاکروبی کا شرف عطا فرمایا۔ الحمد للہ مسلمانوں میں تو لاتعداد انسان اس سعادت سے مشرف ہوئے۔ بَارَکَ اللّٰہُ فِیْھِمْ۔ مگر غیر مسلم بھی اس سعادت کے اثر سے محروم نہیں رہے آپ کا عمل کٹر سے کٹر غیر مسلم کو آغوش اسلام کی طرف لے آنے کا داعی اور محرک بن جاتا تھا جیسا کہ مندرجہ ذیل ایک واقعہ اس کی شہادت میں پیش ہے۔

سنہ ۱۹۴۲ء کی تحریک آزادی میں جبکہ حضرتؒ نینی تال جیل میں تھے آپ کے ساتھ دوسرے نظر بندوں کے ساتھ سیتارام شوکل جی بھی تھے انھوں نے ایک واقعہ تحریر کیا ہے۔

ایک روز ایک قیدی نے آکر فریاد کی کہ نماز پڑھتے وقت میرے پاس فلاں قیدی بھی تھا اس نے میری اٹھنی چرالی۔ حضرت مولانا نے فرمایا میں کیا کروں! میں بھی تمھاری طرح قیدی ہوں، لیکن جب اسے زیادہ رنجیدہ پایا تو اپنے پاس سے اسے اٹھنی دے کر رخصت کر دیا۔ اسے دیکھ کر میں نے مولانا سے برجستہ عرض کیا کہ اب آپ کے اس بیرک میں نہ رہوں گا، کیوں کہ آپ کا اخلاق اتنا وسیع ہے اگر میں تھوڑے دن اور رہا تو میں بھی مسلمان ہو جاؤں گا[1]

چناں چہ حضرت کی عملی زندگی اور اخلاقِ عالیہ نے غیر مسلموں کو مشرف بہ اسلام کیا۔ اگرچہ ابھی حضرت کی سوانح حیات کا یہ اہم باب زاویۂ خمول میں ہے اور اس پر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے مگر یہاں صرف ایک واقعہ مولانا عبدالماجد دریاآبادی کے الفاظ میں درج ہے۔

صدق لکھنو مورخہ ۲ر اگست سنہ ۱۹۴۳ء میں ہے،

مولانا حسین احمد صاحب اب تو غالباً الٰہ آباد جیل میں ہیں، کچھ عرصہ قبل ایک مدت تک مراد آباد جیل میں رہے۔ اس زمانے کے حالات میں ایک معتبر راوی کی زبانی معلوم ہوا کہ مولانا کا بیشتر وقت قرآن خوانی نوافل وغیرہ میں صرف ہوتا تھا باقی وقت خدمت خلق میں کبھی اپنے

---

[1] ملاحظہ ہو "شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی۔ ایک سیاسی مطالعہ" مرتبہ ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری، کراچی، ص

رفیقوں کے لیے کھانا اپنے ہاتھ سے پکار رہے ہیں (ایک مستقل باورچی کی موجودگی کے باوجود) کبھی کسی حقہ نوش رفیق کے لیے چلم بھر رہے ہیں، خیر اس قسم کی خدمتوں کے تو مولانا بادشاہ ہیں.... کبھی کبھی درس قرآن جاری رہا، مسلمان تو خیر اس سے مستفید ہوتے ہی بڑی خوشی کی بات ہے، غیر مسلم بھی نفع سے محروم نہ رہے متعدد افراد اسلام کے قریب آگئے ہیں، اور ایک صاحب جو کہیں کے سیٹھ یا ساہوکار تھے بحمد للہ باضابطہ مشرف بہ اسلام ہو کر رہے"۔

(ماہنامہ تذکرہ، دیوبند۔ مئی و جون ۱۹۵۹ء)

عبد کی واپسی اپنے رب کے پاس

مولانا عبد الباری ندوی

یاایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الیٰ ربک راضیۃ مرضیۃ ہ
فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی ہ

حضرت اقدس مولائی ومولانا المدنی کی خبرِ رحلت کے بعد قلب پر آیت بالا کچھ اس طرح وارد ہوئی کہ جیسے حضرت کی سیرت کا قدِ آدم آئینہ کسی نے سامنے کھڑا کر دیا۔

مال و دولت، جاہ و مرتبت، سیاست و قیادت کی، دُنیا کی کسی چھوٹی بڑی بڑائی کا ذکر کیا، خود دین کی بڑی سے بڑی "دُنیاوی" بڑائیوں کے لیے بھی ہرگز انسان پیدا نہیں کیا گیا ہے، نہ مفکرِ اسلام نہ متکلم اسلام بننے کے لیے، نہ مفسّر و محدث، نہ مجتہد و مجدد، نہ مصلح و مبلغ اور نہ "شیخ الحدیث و شیخ الہند" بلکہ صرف عبد یا بندہ، یعنی سب سے چھوٹا بننے اور اس کی بندگی و غلامی میں لگا رہنے کے لیے۔

مختصر حقیقت اس غلامی و عبدیت کی یہ ہے کہ ظاہر و باطن، دِل و دماغ، اعضاء و جوارح سب کے چھوٹے بڑے ——— دینی و دنیوی، انفرادی و اجتماعی، وطنی و قومی، سیاسی و سماجی، ——— تمام اختیاری اعمال و افعال میں اختیار بھر آدمی صرف اور صرف وہی راہ و روش اختیار کرتے ہیں تن من دھن سے لگا رہے جس میں اپنے حقیقی مالک یا رب کی رضا و خوشنودی جانتا پاتا ہو۔ اسی طرح غیر اختیاری یا تکوینی احوال و معاملات میں فقر و غنا، صحت و مرض، عزت و ذلت، نیک نامی و بدنامی، کامیابی و ناکامی کا ——— جو حال و معاملہ پیش آئے اس کو اپنے "رب اعلیٰ و عظیم" حاکم و حکیم کی طرف سے عین حکمت و رحمت جان کر راضی و مطمئن رہے۔ اصل مطالبہ انسان سے پوری زندگی کو بس یہی عین عبدیت یا سراپا بندگی و سرافگندگی بنا دینے کا ہے۔

حضرت مرحوم اعلیٰ اللہ مقامہٗ کو وقت کے اکابر دین، علماء و مشائخ ہی میں ظاہر و

باطن، علم و عمل، صلاح و تقویٰ کی مسلمہ بڑائی حاصل نہ تھی ــــــ اکابرِ دنیا کی نظر میں آج بہت بڑی بڑائی سیاست و قیادت کی خیال کی جاتی ہے اس کی بھی اپنوں پرایوں سب ہی میں صفِ اوّل کی اہمیت و مقبولیت حاصل رہی۔ لوگوں کی آنکھوں میں (فی اعین الناس)، ان گوناگوں بڑائیوں پر بھی کمالِ عبدیت نے خود اپنی نگاہ میں (فی عینی) اتنا چھوٹا بنا دیا تھا کہ کوئی چھوٹے سے چھوٹا بھی چھوٹا نہ رہ گیا تھا خلوت ہو کہ جلوت، سفر ہو کہ حضر، نجی مجلس ہو کہ کوئی بڑے سے بڑا جلسۂ عام (جس کے خود صدر ہی ہوں) ہر موقع و محل میں سب سے نمایاں حالاً و قالاً بات میں جو شان چھائی رہتی تھی وہ اس مدنی غلام میں اپنے مدنی آقا اکمل العباد کی شانِ عبدیت ہی تھی۔

انسان مال سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر جاہ کا بندہ ہے بالکل سچ ہے کہ "صدیق" کے قلب کا بھی پیچھا سب سے آخر میں جو روگ چھوڑتا ہے وہ جاہ کی طلب ہوتی ہے۔ بڑے بڑے مجاہدوں پر بھی آخر تک نفس سب سے زیادہ کشمکش اپنی انانیت و کبریائی ہی کے لیے کرتا رہتا ہے۔ چھوٹوں ہی نے اپنے بڑوں ــــ باپ، استاد وغیرہ تک کے مقابلے میں اگر کوئی امتیاز و تفوق نصیب ہو جاتا ہے تو اس کو بھی کوئی بڑا عالی ظرف ہی دبا پاتا ہے ورنہ دبانے کے عنوان سے بھی اکثر ابھرنا ہی مقصود ہوتا ہے جب تک خدائی عظمت و جلال اور اس کے روبرو اپنے عجز و نیاز کا پورا پورا استحضار نہ ہو تواضع میں بھی تعلّی کا دعویٰ کھلے چھپے جاری رہتا ہے۔

اس ننگ نام نام لیوا کو تیس سال سے زیادہ ہی خدمت سراپا عبدیت میں دور و نزدیک کے تعلق اور مخاطب و مکاتبت کی سعادت نصیب رہی ہوگی "چشم بد میں" رکھ کر بھی مدنی سیرت کے کسی گوشے میں جس بڑائی کے خلاف کوئی چیز آج ڈھونڈے نہیں ملتی وہ سب سے بڑی یہی بڑائی تھی کہ اپنی بڑائی کے احساس و اظہار کا دُور دُور تک کوئی نام و نشان نہ تھا۔

جس نے خود اپنے نفس و ہوا کو خدا کا بنا رکھا ہو اس کے "محترم قلب" میں غیرِ خدا کی سمائی کہاں سے ہو سکتی ہے (افرأیت من اتخذ الٰهه هواه ..... وختم علیٰ سمعه وقلبه، خدا کو پانے کا راستہ تو از ابتدا تا انتہا خودی کو مٹانا ہی مٹانا ہے۔ فنائے نفس کے بغیر اطمینانِ نفس میسر آنا محال ہے اس "جہادِ اکبر" میں "مدنی" مجاہدِ اعظم کی عظمت کا اندازہ

کرنے کے لیے ذیل کے دو واقعات ہی کافی ہیں جو حضرت کے وصال کے سلسلہ میں شائع بھی ہو چکے ہیں۔

ایک کا ذکر شیخ عبدالعلی صاحب قدوائی نے قومی آواز (۱۷ر دسمبر ۱۹۵۷ء) کے ایک مراسلہ میں کیا ہے حضرت رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد علی مرحوم کراچی جیل میں رفیق زنداں تھے۔ مرحوم کو ذیابیطس کی وجہ سے رات میں بار بار پیشاب کے لیے جانا پڑتا پیشاب کا برتن ہر مرتبہ صاف ملتا سمجھ میں نہ آتا کہ قصہ کیا ہے ایک رات کچھ کھٹک معلوم ہوئی تو مرحوم جاکر کیا دیکھتے ہیں کہ یہ کام چپکے چپکے حضرت انجام دے رہے ہیں۔

خیر محمد علی تو بہر حال مولانا محمد علی تھے اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر اسی جنوری ۱۹۵۸ء کے الفرقان میں حضرت مولانا نعمانی سلمہٗ کی زبان سے اسی رنگ کا ایک اور سبق درج ہوا ہے جو دُہرانے کے لائق ہے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ایک شاگرد نے خود اپنا واقعہ بیان کیا کہ حضرت ریل کا سفر فرما رہے تھے اور یہ صاحب خادم کی حیثیت سے ساتھ تھے انھیں استنجے کا تقاضا ہوا بیت الخلا کا دروازہ کھولا تو بہت غلیظ و گندا دیکھ کر واپس آ گئے تھوڑی دیر بعد حضرت مولانا تیزی کے ساتھ اُٹھے اور بیت الخلا میں داخل ہو کر دروازہ اندر سے بند کر لیا چند منٹ بعد تشریف لائے اور اپنے ان خادم سے فرمایا کہ اب چلے جاؤ انھوں نے جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ حضرت ان کی واپسی کی وجہ محسوس فرما کر بیت الخلا صاف فرماتے تشریف لے گئے تھے۔

فنائے نفس کے ان بے ساختہ انتہائی مدارج تک ذہن بھی کتنوں کا جاتا ہوگا۔ باقی نسبتہً کم درجے کے جو عام تجربات اس فنائی عبدیت کے ہوتے رہتے تھے، وہ بھی کس درجے کے ہوتے، کچھ آپ بیتی عرض ہے۔

ایک مرتبہ دیوبند میں حاضر خدمت تھا کھانے کے وقت ایک ہڈی چچوڑ کر میں نے دسترخوان پر ڈال دی حضرت نے معاً اٹھا کر اس کو پھر خوب چچوڑا اور صاف فرمایا۔ غالباً کچھ گوشت لگا رہ گیا تھا۔ راقم احقر پر اس وقت تک کسی کے جھوٹے سے کراہیت کیا نفرت، اور اس سے بھی بڑھ چڑھ کر جراثیم کا وہم اس درجے مسلط تھا کہ مدتوں جیب میں ٹوٹ کا گلاس رہا کہ کہیں کسی دوسرے کے گلاس میں پانی نہ پینا پڑ جائے! خیال ہوتا ہے کہ حضرت نے اس مرض کا کسی طرح ادراک فرما لیا اور ایسا سبق دیا کہ نفرت و وہم دونوں

کا زندگی بھر کے لیے علاج ہوگیا۔

اسی طرح بڑائی کے مرض کا بھی سخت مریض تھا سفر وغیرہ میں خود بے تکلف اٹھا لینے بھر کا سامان بھی ساتھ ہوتا تو بھی بھلا "پروفیسر" یہ ذلت کیسے برداشت کرتا بعض مواقع پر خود حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے "پروفیسر صاحب" کا سامان قلی کی طرح اٹھا کر آنکھیں کھول دیں! ایک دفعہ دیوبند حاضری ایک خادم کے ساتھ ہوئی خادم کے اس "خادم" کو بھی ساتھ کھانا کھلانے وغیرہ تک میں ایسا "مخدوم" بنایا کہ خود مخدوم کی ساری "مخدومیت" نکل گئی۔ مکاتیب میں بارہا یہاں تک تنزل فرماتے کہ جیسے کوئی چھوٹے سے چھوٹا بڑے سے بڑے کو خطاب فرما رہا ہے۔

فنائے نفس کا یہ رنگ کم و بیش ہر کس و ناکس کے ساتھ تو عام تھا ہی۔ تجربے سے معلوم ہوا کہ بعض اکابر مشائخ کی طرح مدنی شیخ کا یہ خاص ایک تربیتی رنگ بھی تھا۔ خصوصاً اس شر النفوس جیسے آبی النفس مریضوں کے حق میں۔ مگر کتنے شیخ اتنے عالی النفس ہوں گے جو ــــــ اپنے مریضوں کے علاج نفس کے لیے ہی سہی بے نفسی کی اس انتہا تک بے تکلف جا سکتے ہوں۔ اس سے بھی بڑا ایک دوسرا کمال "ہر چہ از دوست می آید نیکوست" والی عبدیت ہی کی اخص الخواص والی شان رضائی المینان کی تھی اس میں بھی کبھی کوئی فرق آتے نہیں دیکھا۔ راقم الحروف کو بعض بہت نجی اور خانگی حالات و معاملات سے تعلق و واقفیت کا موقع حاصل رہا ایسے کہ کم از کم طبعاً تو بڑوں بڑوں کو گھبرا جاتے دیکھا مگر جان و مال کے کسی ضرر و زیاں میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو ذرہ بھر پریشان ہوتے یا زبان پر کوئی حرف شکایت آتے نہ دیکھا نہ سنا بہ ضرورت ذکر بھی فرماتے تو محض حکایت کے عنوان سے۔ شکایت کا لب و لہجہ تک نہ ہوتا۔

آخر آخر میں دینی حمیت اور "البغض فی اللہ" کے اظہار کا رنگ زیادہ تیز ہو گیا تھا پھر بھی ذاتی معاملات میں کسی تلخی و ترشی کے اظہار کیا احساس تک کا پتا نہ ہوتا۔ مخالفوں اور معاندوں سے بھی موقع آجاتے پر معاملہ ہر طرح اپنی والی دست گیری و خیر خواہی کا ہوتا۔ بات وہی تھی کہ دوستی دشمنی ہر بات میں "ہر چہ آں خسرو کند شیریں بود" کی نظر مخلوق سے زیادہ خالق پر جاتی۔ لازماً غلبہ "از محبت تلخہا شیریں شود" ہی کا رہتا، زندگی کے ہر تلخ و شیریں کے ساتھ "رضائی المینان" کا یہ حال و قال جس عبد نے پا لیا ہو، اس کی واپسی کا

حال انشاء اللہ رب کے پاس بجز راضیۃ مرضیۃ اور رب کی طرف سے فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی ہ کے استقبال کے سوا ہونا ہی کیا چاہیے۔
مرض الموت یا مرض "راجعیت الی الرب"، کا مرض وہ بھی قلب کا ایسا سخت وسنگین۔ اس کے بالکل جائز علاج ومعالجہ میں آخر تک بڑی فکر اور سارا خیال واہتمام رضا وتسلیم ہی کا رہا۔ ڈاکٹری کے بعد درمیان میں کچھ دن علاج یونانی ہو گیا تھا ہمارے ڈاکٹر محمد احمد صاحب مدظلہ، جو ماشاء اللہ پورے مستند حکیم بھی ہیں ان کی رائے میں طب یونانی میں قلب کے اس مرض کا کوئی کارگر علاج نہیں ان کا قطعی مشورہ تھا کہ دہلی تشریف لے جاکر امراض قلب کے بڑے سے بڑے ماہر ڈاکٹر کی طرف رجوع فرمایا جائے لیکن ممدوح کسی سے بھی کسی معاملے میں اصرار نہیں فرماتے تو اپنے شیخ ومرشد سے کیا کرتے ایسے مواقع پر تو یہ ادب ناشناس ہی جسارت کر جاتا ہے خود تو مرض وموسم کا بہانہ پاکر عیادت کی ہمت تک سے محروم رہا تاہم عریضہ کے ذریعہ خود حضرت والا اور صاحبزادہ مولانا اسعد اسعدہ اللہ دونوں کی خدمات میں پوری قوت کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کا مشورہ عرض کیا۔
جواب مبارک میں رد وقبول کا انحصار انسانی مشورہ اور غور وفکر سب پر مقدم استخارہ تھا۔ اہل علم ونظر جانتے ہیں کہ دعائے استخارہ کی جوہری روح تمام تر عبدیت تسلیم وتفویض ہے یعنی اپنے علم وقدرت کی بالکلیہ نفی۔ ہر طرح عجز وبے بسی کا اعتراف اور دین ودنیا عاجل وآجل ہر اعتبار سے بندہ کی اپنے خدا کو سپردگی نفس کا یہی رضائی اطمینان جان بندگی ہے۔ رضی اللہ عنہ۔ جواب میں ارشاد ہوا کہ
"بہر حال آپ کا اور ڈاکٹر صاحب کا حکم سر آنکھوں پر۔ استخارہ اور مشورہ اور غور وفکر کے بعد جو کچھ ہو سکے گا عمل میں لایا جائے گا۔ اسعد کے پاس بھی والا نامہ پہنچا۔ دعوت صالحہ سے فراموش نہ فرمائیں۔ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں بھی سلام مسنون عرض کر دیں۔
والسلام

مورخہ ۲ ربیع الثانی ۱۳۷۷ھ

آہ کہ زندگی کی آخری منزل میں خود قلم مبارک سے نامہ مبارک کی یہ دوسری بالکل آخری شرف فرمائی تھی فانا للہ وانا الیہ راجعون ہ

جی چاہتا تھا کہ قرب وصال کے کچھ خاص اقوال واحوال معلوم ہوتے اور عرض کیے جاتے۔
مولانا اسعد میاں سلمہٗ کی خدمت میں عریضۂ تعزیت کے ساتھ ہی اس کی درخواست بھی کی
تھی۔ موصوف نے زحمت بھی فرمائی مگر "آزادی" کے ڈاک خانہ کے یہ تجربات استثنائی
نہیں کہ جواب پہنچا آج تک نہیں۔ حضرت کے ایک بڑے خاص پرانے ـــــ کہنا
چاہیے کہ دن رات کے حاضر باش اور گھر باہر کے ـــــ خادم مخدومی قاری اصغر علی
صاحب کے کرم نامہ نے البتہ عبدیت ہی کے انتہائی احساس واعتراف کا ایک
آخری حال سنایا۔ رفیق اعلیٰ کے حضور میں حاضری کے کل ۲۲ گھنٹہ رہ گئے تھے۔ عصر کی
تیاری تھی کہ حضرت مولانا سید فخر الدین احمد (شیخ الحدیث مراد آباد) کو مخاطب فرماتے
ہوئے فرمایا۔ مخلوق کو مجھ سے کتنا حسن ظن ہے حالاں کہ میں بدترین خلائق ہوں۔ یہ اور
ایسی ہی کچھ باتیں زبان پر آتی تھیں کہ بے قرار ہو کر زار و قطار رونے لگے۔ قاری صاحب
لکھتے ہیں کہ میں نے کبھی پہلے اس طرح روتے نہ دیکھا تھا" دیکھا آپ نے جس کی زندگی
کا کوئی سانس یادِ حق اور کوئی جنبش تعلقِ حق سے خالی نہ تھا۔ اس راہ میں سب کچھ ہو کر
آخر دم تک کچھ نہ ہونے کا یہ حال وقال ہی تو اس کی عبدیت کا عین کمال تھا۔
(ماہنامہ الفرقان، لکھنؤ۔ مارچ و اپریل ۱۹۵۸ء)

. . .
.

وفات حضرت شیخ الاسلام

مولانا خواجہ سی بشیر احمد

آہ وہ کیسی ہیبت ناک شام تھی جب کہ ہمارے کانوں نے رنج وغم سے بھری ہوئی یہ خبر سنی کہ آج ہادی دین مرشد راہ متین حضرت شیخ الاسلام اپنے محبوب حقیقی سے جا ملے۔ یہ خبر کیا تھی ایک بجلی تھی جو گری اور اپنی ہیبت ناکی سے ایک عالم کے قلوب کو ہلا ڈالا۔ حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی وفات حسرت آیات تمام متوسلین اور تمام عقیدت مندوں کے لیے ناقابل برداشت صدمہ ہے۔ حضرت کی وفات سے دنیا کو جو نقصان عظیم ہوا ہو، وہ ناقابل تلافی ہے۔ شاہ ولی اللّٰہی چمن کی آخری کڑی، حضرت حاجی صاحب کی آخری یادگار، شیخ الہندؒ کے سچے جانشین چمنستان قاسمؒ کے روح رواں حضرت شیخ الاسلامؒ ہی تھے۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی سراپا ایثار و قربانی تھی جس کی مثال تاریخ میں صدیوں سے مفقود ہے۔ رات اور دن کی قومی و ملی خدمات اتنی زیادہ ہیں کہ اس کی کوئی مثال نہیں۔ اب دنیا حضرتؒ کی رہنمائی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ترسا کرے گی۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ ایک طرف طلبۂ حدیث کو سیراب کرتے تھے، تو دوسری طرف عرفان و معرفت کے تشنہ کاموں کی پیاس بجھایا کرتے تھے۔ ایک طرف سیاسی لیڈروں کو اپنے زرّیں مشوروں سے سرفراز فرماتے تھے، تو دوسری طرف مہمانوں کو اپنی بے مثال مہمان نوازی سے نوازا کرتے تھے۔

ملامت کرنے والے ملامت کرتے رہے، بُرا کہنے والے بُرا کہتے رہے، مگر آپ کوہِ استقامت بن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چمن کی حفاظت فرماتے رہے۔ آپ کو سوائے اللہ کے کسی کا خوف نہیں تھا، نہ کسی کا اثر آپ کے دل پر ہوتا تھا۔ دوستوں سے جیسا سلوک فرماتے

خلیفۂ مجاز حضرت شیخ الاسلام پر نام ٹب، شمالی ارکاٹ

تھے اسی طرح دشمنوں سے بھی سلوک فرماتے رہے، بلکہ دشمنوں کے حق میں بھی دعا فرماتے رہے
حضرت رحمۃ اللہ علیہ گوشہ نشیں بزرگ نہیں تھے، بلکہ ایک مجاہد اعظم تھے جو مشین کی طرح بے تھکے
کام کیے چلے جاتے تھے، کبھی دارالحدیث میں جلوہ افروز تھے، تو کبھی اپنے محبوب حقیقی کے
سامنے دست بستہ کھڑے رہتے تھے، کبھی سیاسی جلسوں میں شریک ہوتے تھے، تو کبھی وعظ
ونصیحت میں مصروف نظر آتے تھے۔ ایک نور تھا جو اپنی روشنی سے ہر طرف منوّر کرتا تھا
اس پیرانہ سالی میں بھی جتنی ریاضت ومجاہدات فرماتے رہے اس کی نظیر کہیں نظر نہیں آتی۔

بانس کنڈی آسام میں میں نے دیکھا کہ حضرت شیخؒ صرف تین گھنٹے دن رات میں آرام
فرماتے تھے۔ دن بھر روزہ رکھنا اور رات بھر قیام کرنا رمضان میں آپ کا معمول تھا، جب
بھی دیکھا تلاوت کرتے ہوئے دیکھا مختصر یہ کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی سراپا عمل تھی۔

امام العصر علامۃ الدہر سرتاج الاولیا نمونہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے
صرف صاحبزادے مولانا اسعد صاحب اور ارشد سلمہٗ ہی یتیم نہیں ہوئے بلکہ تمام متوسلین
اور عقیدت مند بھی یتیم ہو گئے مگر موت العالم کے مصداق موت، تو عالم کو ہوئی۔ الحمد للہ
ان کو تو ابدی حیات حاصل ہے۔ اب بھی ان کی روحانیت کام کر رہی ہے انشاء اللہ
ان کی برکتیں ہمارے ساتھ رہیں گی۔

حضرت کے کارنامہ بھی ہمارے پاس موجود ہیں لہٰذا میں تمام متوسلین اور عقیدت مندوں
سے درخواست کرتا ہوں کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے نقش قدم پر چلنے کی پوری سعی فرمائیں،
دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کی قبر کو نور سے بھر دے اور ان کے
درجات بلند فرمائے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی ہمیں توفیق عطا فرمائے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ
کے متعلقین اور ہم غمزدوں کو صبر عطا فرما دے، آمین۔

(روزنامہ الجمعیۃ۔ دہلی ۳؍فروری ۱۹۵۸ء)

. . .

مولانا مدنی کا آخری سفر

ڈاکٹر رشید احمد جالندھری

خبر ملی کہ مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ رگمزائے عالم بقا ہوئے معاً حسان رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کا شعر یاد آگیا جو موصوف نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت سے متاثر ہو کر موزوں کیا تھا ؂

ضحوا باشمط عنوان السجود بہ
یقطع اللیل تسبیحا وقرآنا

لوگوں نے ایسا سفید ریش انسان اپنے ہاتھوں سے گنوایا ہے جو عنوانِ سجود تھا اور جس کی راتیں تسبیح وتلاوت قرآن میں بسر ہوتی تھیں۔

مولانا مرحوم کی وفات پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہوگا اور ان کے فراق پر ہر صاحبِ درد نے حُزن کے آنسو بہائے ہوں گے لیکن مجھے یہاں نہ تو اپنے غم وحزن کا بیان مقصود ہے کیونکہ یہ شیوۂ اصحابِ درد نہیں اور نہ ان کے ایثار واخلاق سے متعلق کچھ عرض کرنا ہے اس لیے کہ یہ اوصاف محتاج تعارف نہیں بلکہ مجھے اگر کچھ بیان کرنا ہے تو صرف یہ کہ جس طرح ان کی پاکیزہ زندگی ہمارے لیے ایک زرّین سبق تھی ٹھیک اسی طرح آج ان کی وفات بھی ہمارے لیے سرمایۂ عبرت وموعظت ہے۔ سکندرِ اعظم کی موت پر کہنے والے نے کہا تھا کہ تم کل سے زیادہ آج ہمارے لیے باعث عبرت ہو۔

اگر کسی بڑے انسان کی موت ہمارے لیے چشم کشا ثابت ہو سکتی ہے اور

صدر شعبہ اسلامیات بلوچستان یونی ورسٹی، کوئٹہ۔ جب یہ مضمون قلم بند کیا گیا تھا تو ڈاکٹر صاحب قاہرہ میں تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے فارغ عن التحصیل، حضرت شیخ الاسلام کے تلمیذ رشید۔

اس سے ہم درس عبرت حاصل کر سکتے ہیں تو زہے نصیب، ورنہ ہماری بدبختی میں کیسے شبہ کیا جا سکتا ہے۔ حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سربگریبان بیٹھے تھے کہ دو راہبوں نے انہیں دیکھا اور آپس میں کہا کہ چلو ذرا اُس شخص سے ملیں اس کی شکل و صورت تو حضرت مسیح سے ملتی جلتی نظر آتی ہے پاس آئے تو سُنا کہ حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ چلتے پھرتے عوام کی غفلت پر ان الفاظ میں اظہار حیرت فرما رہے تھے۔ حیرت ہے اس قوم پر کہ اسے زادِ سفر مہیا کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور سفر کی گھنٹی بھی بج چکی ہے مگر یہ ہے کہ لہو و لعب میں مشغول ہے کاش مجھے علم ہوتا کہ ان سرگشتگانِ غفلت کو اور کس چیز کا انتظار ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ موت کے تصور سے بڑے بڑے جلیل القدر انسان لرزتے رہے ہیں بلکہ یوں کہیے کہ موت کے خوف ہی سے اِنسانوں نے عظمت و جلالت کا مقام پایا ہے جو لوگ زندگی کے ہر لمحے اور ہر لحظے پر نظر رکھتے ہیں وہی زندگی میں کامیاب ہیں ورنہ بے فکرے اپنی نامرادی پر جتنا روئیں اتنا ہی کم ہے۔ حجاج نے کیا پتے کی بات کہی ہے:

جو شخص خدا کی یاد، فکرِ آخرت، اور توبہ و استغفار سے ایک لمحہ بھی غافل رہا اسے اپنی نامرادی پر قیامت تک خون کے آنسو بہانے چاہییں۔

حجاج کا ذکر آیا ہے تو اسی موضوع میں اس کی ایک دوسری تقریر سُنیے جو آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے:

لوگو! اپنے نفس قابو میں رکھو خدا کی قسم یہ کچھ اس قماش کے ہیں کہ اگر ان پر جُود و نوال کے دروازے کھولے جائیں تو یہ دریوزہ گری پر اُتر آتے ہیں اور اگر خود ان کے آگے دستِ دراز کیا جائے تو حد درجہ بخیلی کا ثبوت دیتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ خدا کے عذاب پر صبر کرنے سے کہیں زیادہ آسان چیز ہے کہ اس کی حرام کردہ اشیاء پر صبر کیا جائے، یعنی معاصی سے بچنا تو آسان ہے لیکن اس کے انجام سے بچنا آسان نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ موت خواہ کسی عارف کی ہو یا عامی کی دونوں صورتوں میں اہلِ بصیرت کے لیے ایک درسِ بصیرت ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ جب اس کا وار ہمارے کسی عزیز پر ہوتا ہے تو پھر ہم تلخی کام و دہن کی آزمائش کے پڑاؤ سے گزر کر وہاں پہنچ

جاتے ہیں جہاں "زہرِ غم" ہمارے رگ و پے میں سرایت کیے ہوتا ہے۔
یہ غم کہ نہ جانے ہماری شب غم کیسے کٹے گی؟ کہتے ہیں کہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ علیہ السلام کو خواب میں دیکھا تو کہا یا رسول اللہ علیہ السلام کیا بتاؤں کہ آپ کے بعد کیا کیا مصائب اٹھائے ہیں پتا نہیں کہ علیؓ کے اس جملے میں کیا چیز پوشیدہ ہے کہ جب بھی اسے پڑھا ہے آنکھوں میں آنسو تر آئے ہیں یا پھر یہ غم کہ نہ جانے جانے والا کس حال میں ہوگا عمر بن ذرہ نے اپنے بیٹے کی وفات پر کہا کہ بیٹے تیری وفات سے جو غم لاحق ہوا ہے میں اسے تیرے اس غم کے مقابلے میں جو تجھے درپیش ہے بھول گیا ہوں۔ کسی نے عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خواب میں دیکھا حال دریافت کیا فرمایا رحیم و کریم پروردگار سے واسطہ نہ پڑتا تو میرا تختِ عظمت چکنا چور ہو گیا ہوتا۔

یہ ہیں عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہ بیسویں صدی کا انسان بھی ان کے عدل و انصاف کو خراج تحسین ادا کرنا اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتا ہے۔ موت سے کسی کو مفر نہیں پھر اس سے غافل رہنے کے کیا معنی؟ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمایا کرتے تھے:

موت ایک ایسا دروازہ ہے جس سے ہر انسان کو گزرنا ہے۔ کاش! مجھے پتا ہوتا کہ اس دروازے سے ہو کر کس گھر میں داخل ہونا ہے جنگ جمل میں سیکڑوں نیک انسان نیکوں کے ہاتھوں قتل ہو گئے اس جنگ میں علیؓ کی جیت ہوئی مگر جب اس آغوشِ نبوت کے پروردۂ ناز انسان کی نظر مقتولین پر پڑی ان مقتولین پر جو مخالف صف میں ان سے لڑے تھے تو شدتِ غم سے نڈھال ہو گئے اور فرمایا۔ خدایا تیرے ہی سامنے اپنے غم و حزن کی داستان لے کر آیا ہوں اور وہ یہ کہ اپنی قوم کو قتل کر کے میرے نفس نے تسکین پائی ہے۔

علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہی وہ پاکیزہ سیرت ہے کہ آج بھی جویائے حقیقت کے لیے مشعلِ راہ ہے مخالف صف میں لڑنے والے شہدا کا جنازہ خود پڑھا دیا پیکرِ درد بن کر ان کے لیے خدا کے حضور دعائیں مانگیں۔

کاش علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نقشِ قدم پر چلنے والے علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دوستوں ہی سے نہیں بلکہ کسی انسان سے بھی بغض و حسد نہ رکھتے۔

بہر نوع بات یہ چل رہی تھی کہ موت اور ماورائے موت کے شعور سے ہر صاحبِ فکر

انسان نے خوف کھایا ہے اور جن خوش نصیب انسانوں نے اس سفر کے لیے زندگی بھر تیاری کی ہے۔ مولانا حسین احمد مدنی مرحوم انہی عظیم انسانوں کے زمرہ میں داخل ہیں۔ مولانا نے صرف اپنی زندگی ہی کو نہیں سنوارا بلکہ تربیت سے سیکڑوں لوگوں کی زندگیوں کو سنوارا ہے مولانا چاہتے تو دنیا اپنی پوری دلفریبیوں کے ساتھ ان کے پہلو میں بیٹھنے کے لیے تیار تھی مگر انھوں نے اس کی جھوٹی مسرتوں اور خوشیوں کی جانب نگاہ اٹھا کر دیکھنا بھی اپنے لیے عار سمجھا، ورنہ یہاں کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جن کی زندگیاں وقف عیش و نشاط ہیں مگر نا آشنائے مسرت ہیں۔ کوئی یہ خیال ہرگز نہ کرے کہ یہ دولت و ثروت میں کھیلنے والے اور شراب و شاہد کے ماحول میں سرمست رہنے والے انسان مسرتوں اور خوشیوں سے مالا مال ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ لوگ ہیں جو محروم مسرت ہیں۔ شاید جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ نے کہا تھا کہ اگر بادشاہ وقت کو یہ پتا چل جائے کہ نماز صبح گاہی سے مسرت و شادمانی کی کونسی دولت مجھے میسر آئی ہے۔ تو وہ مجھ پر چڑھائی کر دے۔

واقعہ یہ ہے کہ مسرتوں کا سرچشمہ دل ہے اگر لذت آشنائی اور جذبۂ خیر سے معمور نہ ہو تو پھر انسان کے پاس نامرادی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

اور یہ چیزیں اسی وقت حاصل ہو سکتی ہیں جب دل کے پہلو میں موت کا کانٹا برابر چبھتا رہے اور وہ جہاں سے آیا ہے وہیں جانے کی تیاریوں میں مشغول رہے۔ خدا ابوالعتاہیہ پر رحم کرے کبھی موت سے اس قدر غافل تھا کہ گویا یہ کوئی چیز ہی نہیں لیکن جب موت کی یاد آئی تو پوری دنیا ہیچ نظر آئی اور سرگشتگان غفلت کی محرومی پر وہ نوحہ و ماتم کیا کہ الامان والحفیظ۔ اور آج یہی نوحہ و ماتم عربی ادب کا مایۂ ناز سرمایہ ہے سچ کہا جس نے کہا کہ جب تک انسان مبتلائے رنج و محن نہیں ہوتا، اور دل خون نہیں ہوتا اس وقت تک اس کے کلام میں سوز پیدا نہیں ہوتا اور اگر ایسا ہو جائے تو پھر اس کا ہر آنسو شعر کی بحر ہے اور دل کی ہر دھڑکن موسیقی کی آہنگ۔ ابو عتاہیہ کہتا ہے:

(ترجمہ) "تمھاری ولادت موت کے لیے، تمھاری تعمیر تخریب کے لیے ہے تم سب کا انجام موت ہے یہ عیش و عشرت کس کے لیے ہے حالاں کہ ہم تو جس مٹی سے پیدا کیے

گئے ہیں اس میں ملنے والے ہیں ہیں نے تم سے اے دُنیا! غم، بلا، مصیبت کے سوا کچھ نہیں پایا اس کے علاوہ تم نے میری ہر طلب پر معذرت کی، مرحوم بجنوری نے کہا کہ دنیا کا عیش و نشاط کمزوروں اور کم ظرفوں کا حصّہ ہے جو زندان آتش نوش ہیں ان کے لیے شراب غم مخصوص ہے جو کیف رنج سے معمور ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ جب دنیا کی تمام لذتوں کو چھوڑ کر موت سے ملے بغیر چارہ ہی نہیں ہے تو پھر کیوں نہ اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا جائے! اور زندگی کو سنوار نکھار کر اس کی خدمت میں پیش کیا جائے۔

مولانا نے جس پاکیزہ زندگی کو موت کے حوالے کیا ہے موت کو ایسی زندگی آسانی سے کہاں میسر آئی ہوگی۔ جس کا ایک ایک گوشہ اخلاص و ایثار کے چراغوں سے روشن ہے، مولانا کی پاکیزہ زندگی کا تابناک پہلو یہ ہے کہ وہ بے سروسامان طالب علموں اور بے یار و مددگار انسانوں سے بے پناہ پیار کرتے تھے اور اپنے حسنِ عمل سے نادان لوگوں کی خرابیوں کی اِصلاح فرمایا کرتے تھے مولانا کی زندگی کے اس نمایاں پہلو کی قدر و قیمت کو وہی لوگ جان سکتے ہیں جنھیں مولانا سے اور "دعویداران زہد و تقویٰ" دونوں سے ہی واسطہ پڑا ہو یا جن کے حصّے میں مشیخت و زہد کی محفلوں سے اُٹھائے جانے کی سعادت آئی ہو بار ہا اُلٹی محفلوں سے اٹھایا گیا ہوں اور جب بھی اپنی غلطیوں کی فہرست پر نظر ڈالی تو ان میں سرفہرست ناقابل عفو غلطی یہ تھی کہ جھوٹی پارسائی و درویشی کے مندروں پر نذرانہ چڑھانے کے لیے جیب پیسوں سے خالی تھی اور قلب و نظر عقیدت سے۔ اس کے برعکس مولانا کی محفل تھی کہ اس میں ساقی کی نگاہِ کرم اسی پر پڑتی تھی جو سب سے زیادہ غریب سب سے زیادہ نادان اور سب سے زیادہ بے یار و مددگار ہوتا تھا۔ چنانچہ آج مولانا کی وفات پر وہ لوگ سب سے زیادہ آنسو بہائیں گے جن کو وقت کی چیرہ دستیوں اور فقیہان شہر کی قہرمانیوں سے زیادہ واسطہ پڑا ہے۔

کاش! مجھ آوارۂ دشت سفر کے بس میں یہ بات ہوتی کہ ان کی قبر پر حاضر ہو سکتا اور دو آنسو بہا سکتا ؎

زچشم آستیں بردار و گوہر را تماشا کن

فرزدق کو شاید ایسا ہی معاملہ پیش آگیا تھا نوار کی موت واقع ہو گئی تو نوحہ و ماتم کرنے کے لیے اپنے حریف جریر کے کلام کو مستعار لیتے ہوئے کہا:

اگر حیادامن گیر نہ ہوتی تو آنسو بہ پڑتے اور میں تیری قبر پر آتا، کیوں کہ محبوب ہی تو مستحق زیارت ہے۔

خدا مولانا کی قبر پر تا روزِ حشر اپنی رحمتوں کی بارش برسائے اور ان تمام انسانوں کی مغفرت فرمائے جو ہم سے قبل ایمان و عمل کی دولت کو لیے ہوئے خدا کے پاس جا پہنچے ہیں اور ان کی موت ہمارے قلب و نظر اور فکر و عقل کے لیے عبرت و نصیحت کا سروسامان مہیا کرے کیوں کہ ہم بیچارگانِ روزگار خراب کو اسی کی ضرورت ہے۔

(ہفت روزہ چٹان لاہور مورخہ ۲۷ر جنوری ۱۹۵۸ء، ۳ر فروری ۱۹۵۸ء)
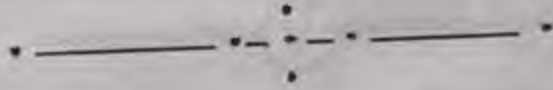
• ——— •-•-•-• ——— •

مولانا نجم الدین صاحب اصلاحی رح کی مرتب کردہ

مکتوبات شیخ الاسلام رح کامل چار جلدیں

جدید اضافہ شدہ ایڈیشن

یعنی

قطب الارشاد، شیخ العرب والعجم حضرت مولانا حافظ الحاج سید حسین احمد مدنی قدس سرہ

شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کے ان خطوط کا مجموعہ جو انھوں نے اپنے دوستوں عزیزوں اور ارادتمندوں کو لکھے جن میں مذہبی، علمی، فقہی اور ملکی و سیاسی خیالات و افکار و مسائل کا بڑا عظیم الشان ذخیرہ موجود ہے۔

یہ چاروں جلدیں پہلے لیتھو کی کتابت پر طبع ہوئی تھیں چونکہ اب لیتھو کا سلسلہ ترک ہو گیا ہے۔ اس لئے اب نئی آفسٹ کی کتابت کرا کر پاکستان میں پہلی مرتبہ مکتبہ رشیدیہ نے شائع کی ہیں۔ بہتر کتابت، طباعت عمدہ ریگزین کی جلد

۴ حصے تین جلد میں مکمل

مجلس یادگار شیخ الاسلام رح پاکستان کراچی